

شکلا

قیمت { فی پرچہ ۷۵ نئے پیسے
سالانہ دس روپے

ماوروطن کی فلاح و بہبود کے لیے

ہمارے اقدامات

نہایت نفیس پاندار اور ہموار

اوتی ویونگ یارن

اور
ہینڈ ٹنگ وول

جدید ترین طریقے سے تیار کیے جاتے ہیں
گمرینڈا سے کم کوئی اون قبول نہ کیجئے

۵ دلکش رنگوں میں دستیاب :- میرا - پارکو - ساوینا - کلاکار اور نوٹیک
اپنی پسند کے مطابق شدت طلب کیجئے



گوکل چند رتن چند ورن ملز پرائیویٹ لمیٹڈ بمبئی • دہلی • امرتسر

فوری اعلان

پاکستانی خریدار نگار کا چندہ اس پتہ پر
بیمبئی رسالہ جاری کر دیا جائے گا
شمارہ نگار ۶۱۴ سمن آباد لاہور

نگار

ایڈیٹر
اکبر علی خاں

شمارہ (۱۲)

فہرست مضامین دسمبر ۱۹۶۳ء

جلد (۲۲)

۳۳	نقی احمد ارشاد	۲	ملاحظات
۴۵	مرزا محمد فخر میمن	۳	خواجہ احمد عباس آئینے میں
	متطو ماست	۹	خواجہ احمد عباس راجندر سنگھ بیدی کی نظر سے ترجمہ روح افزا
	میکیش اکبر آبادی		یاس و یگانہ کا مرتبہ بحیثیت نزل گو
	جادید کمال رامپوری	۱۵	ملک اسٹیل حسن خاں
	سید حرمت الاکرام		

ملاحظات

کیا دوانے نے موت پائی ہے

مدر جان فٹز جرالڈ کینیڈی کا قتل بیسویں صدی کے سنگین ترین جرائم کی فہرست میں سب سے زیادہ لائق نفرت اور نمایاں جرم ہے۔
رنگ و نسل کے خلاف ایک عظیم مجاہد کی حیثیت سے ان کا نام تاریخ عالم میں جلی حروف سے لکھا جا چکا۔ آہنی عزم کے اس انسان نے
حقوق انسانی کے لیے جتنے نڈر سو کر کام کیا وہ اسی جیسے تو منہ جسم اور صحت مند ذہن و فکر کا مالک کر سکتا تھا۔

یقیناً اپنے ملک و قوم کی خاطر قربانیاں دینے والوں کی کمی اس "مصنوعی" دور میں بھی نہیں ہے مگر شہید کینیڈی نے کالوں کو جینے کوئے
دیس کی زمین اور گورے رنگ قبول کرنے کے لیے نہ صرف یہ کہ آبادہ نہیں ہیں بلکہ ان کے خلاف کینہ ذہنیت کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔ جائز
مقام دلانے کے لیے انہوں کی دشمنی مول لی اور بالآخر اسی مقصد کی خاطر اپنی زندگی کے اس دور میں جو آئندہ دنیاوی کامرائیوں اور عزت و وقار
کے لیے راہیں ہموار کر رہا تھا اور شخصی اور قومی دونوں حیثیتوں سے روشن مستقبل کی ضمانت دے رہا تھا، کسی مخالف طاقت کی پروا نہ کرتے
ہوئے جس غفلت کو نادر عمل کا ثبوت دیتا ہے وہ اس کے جانیشینوں کے لیے ایک امتحان بن گیا ہے۔

آج اس کی یہ ناقابل فراموش قربانی ایک سوالیہ نشان بن کر راستہ روکے کھڑی ہے اور خاندان آدم کے ہر فرد سے اپنا جواب
مانگتی ہے۔

کون اسے فرزند اسے آگے بڑھائے گا

یہ داستان شوق یہاں ہم نے چھوڑ دی

کوئی ہے جو اس آواز پر لبیک کہے کہ انسانیت کی لٹ رکھ لے !

خواجہ احمد عباس آئینے میں

مگاہ کا آئینہ

انچاس برس تک وہ مجھ سے کتراتا رہا مگر پھر آخر ایک دن ہمارا آنا سامنا ہو ہی گیا۔
میں نے کہا۔ بات کیا ہے میں نے تو کبھی تمہیں قرض نہیں دیا، پھر یہ مجھ سے کیوں آنکھیں چراتے ہو؟ کیا تم مجھ سے شرماتے ہو؟
مجھ سے نفرت کرتے ہو؟

اس نے کہا۔ میں تم سے شرماتا بھی ہوں، ڈرتا بھی ہوں، مگر میں تم سے نفرت نہیں کرتا۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ اگر میں دنیا میں کسی سے محبت کرتا ہوں تو صرف تم سے۔ محبت کیا ہے اور نفرت کیا ہے؟ سچ پوچھو تو یہ مجھے بھی نہیں معلوم۔ ہو سکتا ہے محبت اور نفرت ایک ہی سکتے کے دو رخ ہوں۔ شاید اسی لیے میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم سمجھتے ہو کہ میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔
میں نے کہا۔ آج کل ہی گئے ہو تو وہ دو دباتیں ہو جائیں۔ میں تمہارے بارے میں سب کچھ جانا چاہتا ہوں، سب کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔

”یوں کہو کہ میرے ڈھول کا پول کھولنا چاہتے ہو؟“ اس نے کہا! تبھی تو میں تمہارا سامنا کرنے کتراتا تھا۔ کیوں دنیا کے سلف نے میری مٹی پلید کرنا چاہتے ہو؟ بہت سے ایسے چہرے ہیں جن پر پردہ ہی پڑا رہے تو اچھلے۔
”مگر میں نے تو کبھی کسی آئینے پر پردہ پڑا نہیں دیکھا، اور کہا جاتا ہے آئینہ جھوٹ نہیں بولتا۔“

وہ بولا۔ ”کون کہتا ہے آئینہ جھوٹ نہیں بولتا؟ ایک آئینہ ہوتا ہے جس میں دہلا آدمی ٹوٹا نظر آتا ہے۔ دوسرا آئینہ ہوتا ہے جس میں چھوٹے قد کا آدمی لمبا دکھائی دیتا ہے۔ بد صورت سے بد صورت آدمی کو بھی آئینے میں اپنا چہرہ خوب صورت ہی لگتا ہے۔ اگر آئینے سچ بولتے تو دنیا میں ایک آئینہ بھی نہ بچتا، سب چکنا چور کر دیے جاتے۔“

میں نے کہا۔ تو پھر مجھے بھی ایک آئینہ ہی سمجھو۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو پھر بتاؤ کیا دکھائی دیتا ہے؟
اس نے کہا۔ ”ایک چھوٹے قد کا گنجا آدمی، چھوٹی چھوٹی آنکھیں اندر کو دھنی ہوئی آنکھوں کے گرد کالے کالے حلقے جیسے کتنی ہی راتوں سے نہ سویا ہو، چہرے پر بڑھاپے کی جھریاں تو نہیں مگر ماتھے کی گہری لکیریں بتا رہی ہیں کہ غم کے کتنے ہی طوفان اس پر سے گذرے ہیں۔ جیسے اس کی زندگی کا ہر برس سات سو تیس دن کا گذرا ہو۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا تم اسے پہچانتے ہو؟ پہلے کبھی دیکھا ہے؟“
”اس نے کہا۔ صورت جانی پہچانی لگتی ہے۔ مگر یاد نہیں آتا کہ کہاں دیکھا ہے۔“
میں نے کہا۔ غور سے دیکھو کہیں آئینے میں اپنی ہی صورت تو نہیں دیکھ رہے؟

اس نے کہا۔ ”لا حول ولا قوۃ۔ کیا تم مجھے اتنا بد صورت سمجھتے ہو؟“ ٹیلی ویژن کی طرح میرا تھا ادنیٰ ضرر ہے، مگر میں گنجا نہیں ہوں۔ مانا کہ میں جیسے دیدے نہیں ہیں میرے، مگر آنکھیں اتنی چھوٹی بھی نہیں ہیں جیسے کسی نے ریت میں تھوک دیا ہو۔ نہیں جی میں اس گنجنے کوٹ کو نہیں جانتا۔

میں نے کہا۔ ”دوست یہی تو مشکل ہے۔ انسان چاند کا خرافہ جانتا ہے، مگر اپنا چوکھٹا نہیں پہچانتا۔“

دہ چڑھ کر بولا۔ کیا کہیا؟

کچھ نہیں، میں تو ہمتیاری زندگی کے حالات جاننا چاہتا تھا۔
”کیوں؟“

”ایک مضمون لکھنا ہے اپنے بارے میں، مطلب یہ کہ تمہارے بارے میں۔“

”کیا اس مضمون کے پیسے ملیں گے؟“

”ہاں، ملیں گے۔“

تو یوں کہہ مجھے بچنا چاہتے ہو۔ اور سب تو بیچ چکے ہو۔ اپنا قلم، اپنا دماغ، سنبھالے اپنا دل بھی کئی بار گرو دی رکھ چکے ہو۔ اب رہ کیا گیا ہے؟ چلو مجھے بھی بیچ ڈالو۔“

تو پھر اپنے حالات زندگی بتاؤ۔“

تاریخ پیدائش: سات جون ۱۹۴۵ء سوچو وہ۔ تاریخ وفات: ابھی معلوم نہیں۔“

”ان دونوں تاریخوں کے بیچ میں کیا ہوا؟“

”بیچ بتاؤں؟ اس نے پوچھا۔“

”ہاں بالکل سچ۔“

”سچ تو یہ ہے کہ کچھ نہیں ہوا۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ ہے کہ میری ہستی سے دنیا میں کوئی انقلاب نہیں آیا، کوئی لیلیٰ مجنوں جیسا لازوال عشق نہیں ہوا، کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ آرٹ کا کوئی شاہکار تخلیق نہیں ہوا۔ کسی نئی دنیا کا پتہ نہیں لگا۔“

”تو پھر انچاس برس کی زندگی میں تم نے کیا کیا؟“

”بھٹک ماری۔ پچاس ہزار گھنٹے دوستوں کے ساتھ گپ کی، پچاس ہزار چار کی پیایاں پییں۔ ایک لاکھ سفید کاغذ کے درق سیاہ کیے پندرہ ہزار گھنٹے سینما کے اندھیرے میں کائے، سوا سو قاذوٹن مین خریدے، گھسے اور کھوئے سات ٹائپ رائٹر دل کو پیٹ کر کھٹا رابنا دیا پانی پت، غلی گٹھ، دہلی اور بمبئی، ہانگ کانگ، شنگھائی، ٹوکیو، لندن، پیرس، نیویارک اور ماسکو کی سڑکیں ناہیں۔“

اس سب ادٹ پٹانگ پردگرم سے تو یہی پتہ نہیں چلتا کہ تم کرتے کیا رہے؟ آخر ہمتیاریا پتہ کیا ہے؟

”ادیب اور تنقید نگار کہتے ہیں کہ میں اخبارچی ہوں، جرنلسٹ کہتے ہیں میں فلم والا ہوں، فلم دان کہتے ہیں میں ایک سیاسی پردہ نگار ہوں، سیاست دان کہتے ہیں میں کیونسٹ ہوں۔“

”کیونسٹ کہتے ہیں میں برزوا.....“

”مگر تم سچ بچ ہو کیا؟“

”کوئی بتلاؤ کہ تم بتلاؤ کیا؟ سچ تو یہ ہے کبھی خود نہیں معلوم کہ میں کیا ہوں۔“

”پھر بھی سنا ہے تم نے کتنی ہی کتابیں لکھی ہیں۔“

”یہ الزام تو لگا یا گیا ہے مگر آپ ثابت نہیں کر سکتے۔ ایک نقاد نے تو میری پہلی کتاب پڑھ کر فتویٰ دے دیا تھا کہ کتاب میں نے کسی اور سے لکھا کر اپنے نام سے چھپوائی ہے۔“

”سنا ہے تم نے کئی فلمیں بھی بنائی ہیں؟“

آہستہ بڑھ رہیں کوئی فائبر نہ سن لے اور ڈگری لے کر میرا پلنگ، تین کرسیاں، ستائیس من پرانی کتابیں اور سترہ من ردی کاغذ قرق کرانے آجائے۔

اچھا یہ بتاؤ تمہارے دل کی سب سے بڑی تمنا اور خواہش کیا ہے؟

”ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔ دل چاہتا ہے کہ میرے سر پر گھنے سیاہ بال آئیں اور ایک بار میں پھر جوان ہو جاؤں۔ دل چاہتا ہے کہ میں ٹائٹل کے ’فاراينڈ پيس‘ جیسا ناول لکھ دوں، دل چاہتا ہے کہ میں ایک ایسا فلم بناؤں جس کا ساری دنیا میں چرچا ہو۔ دل چاہتا ہے میں ماڈرنٹ اور سٹ پرچڑھ جاؤں، اسپونٹنک میں بیٹھ کر چاند کی سیر کر آؤں، جی چاہتا ہے کہ میرا ایک خاص اپنا کمرہ ہو جس میں چاروں طرف کتابوں کی اماریاں ہوں اور ایک ریڈیو گرام ہو اور دنیا کے بہترین موسیقی کے ریکارڈ ہوں اور زمین پر چٹائی کا فرش ہو۔ اور لیٹنے کے لیے ایک گدا ہو، ایک بھلی کا ہیٹر ہو، جس پر ہر وقت چار مٹی رہے، کئی فائڈ ٹین پین ہوں۔ ایک بہت بڑی روشنائی کی بوتل ہو اور سو سادے کاغذ ہوں اور وقت ہو۔ اپنی پسند کی کتابیں پڑھنے کے لیے اپنی پسند کی کتابیں اور کہانیاں لکھنے کے لیے اپنی پسند کی میوزک سننے کے لیے اپنے خاص دستوں سے گپ بازی کرنے کے لیے۔ سونے کے لیے وقت ہو اور کبھی سوچنے کے لیے بھی وقت ہی۔“

”تو پھر یہ بھی بتاؤ کہ تم نے لکھنا کب شروع کیا اور کیوں؟“

میں نے لکھنا شروع کیا جب میں کلچ میں پڑھتا تھا۔ مگر کیوں؟ اس کے تین سبب تھے۔ پہلا سبب تھا میرا ٹھکانا قند اور دبلا پتلا جسم۔ کرکٹ۔ فٹ بال۔ ہاکی۔ ٹینس میں میں سب سے برا سمجھا جاتا تھا اور یونیورسٹی میں صرف کھلاڑیوں ہی کی قدر کی جاتی تھی۔ مگر میرا جی چاہتا تھا، میرا بھی نوٹس لیا جائے، میں بھی کوئی ایسا کام کر دوں کہ یونیورسٹی میں میرا چرچا ہو۔ لہذا میں نے یونین کی ڈبٹیوں میں حصہ لینا شروع کیا، پھر یونیورسٹی میگزین میں لکھنا شروع کیا، پھر یونیورسٹی ہی سے اپنا ہفتہ وار پرنسپل نکالا۔ پھر دہلی اور بمبئی کے اخباروں میں لکھنا شروع کیا، پھر افسانے لکھے اور پھر کتابیں۔

دوسرا سبب تھا انگریزوں کی حکومت، جس نے مجھے پہلے پبلک سیکرٹری پھر جرنلسٹ اور پھر مصنف بنا دیا۔ جلیان والا باغ کے قتل عام سے اگلے برس کا ذکر ہے، میں شاید پانچ چھ برس کا تھا جب ہمارے قصبہ کے سیکرٹریوں بچوں کو جرنیلی سڑک کے کنارے کھڑا کیا گیا۔ صبح سے شام تک سڑک پر فوجی گھوڑ سوار رسالے گنتے رہے اور لال منہ کے انگریز سپاہی ان کی بند دتیں رانقلیں سنگین مشین گنیں توپیں دیکھ دیکھ کر بچوں کے دل دہلتے رہے۔ اور یہی اس پریڈ کا مقصد تھا کہ بچوں کے دل میں سامراج کی فوجی طاقت کی دہشت بٹھا دی جائے۔ مگر نتیجہ اس کا اسٹانکلا۔ ایسی ہی ایک پریڈ پنجاب کے ایک اور قصبے میں ہوئی تھی، ایک سکھ بچے کے دل میں انگریزی سامراج کے لیے ایسی نفرت بیٹھ گئی کہ بڑا ہو کر وہ دہشت پسند انقلابی بن گیا۔ اس کا نام تھا بھگت سنگھ، ہزاروں اور بچوں نے بڑے ہو کر کسی انگریز پر پستول تو نہیں چلایا مگر ان کے دلوں میں بھی انقلابی سیاسی خیالات پر دان چڑھتے رہیں۔ ان ہی میں سے ایک میں بھی تھا۔ میں کمزور تھا پستول اور بم نہیں چلا سکتا تھا۔ میں نے سوچا حکومت کے خلاف میرا ہتھیار میری آواز ہوگی، میرا قلم ہوگا۔

”تیسرا سبب؟ اٹھارہ برس کی عمر میں مجھے کسی سے محبت ہو گئی (اور باوجود ادب و نہایت سی محبتوں کے نہ پہلی محبت تیس برس بعد اب بھی جمان ہے) اور اکیس برس کی عمر میں مجھے اس محبت میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ایسی حالت میں ناکام عاشق کے سامنے تین راستے ہوتے ہیں۔ یا تو وہ خودکشی کرتا ہے (مگر میں موت سے ڈرتا تھا اور اب بھی ڈرتا ہوں) یا وہ شاعری کرتا ہے اور شراب پیتا ہے (مگر مجھے شاعری سے کوئی دل چسپی نہ رہی تھی۔ حالانکہ میرے پرانا ناخوابہ الطاف حسین حالی اپنے زمانے کے مانے ہوئے شاعر تھے، اور شراب مجھے کڑوی لگتی تھی) یا وہ انسانے لکھتا ہے اور ان انسانوں میں اپنے ناکام عشق کی داستانوں کو ڈھال کر اپنے گھائل دل کو تسلی دینے کی کوشش کرتا ہے (اور سو یہی میں نے کیا)

میں نے پوچھا۔ تو کیا تم سمجھتے ہو کہ ہر ناکام عاشق انسانہ نگار بن سکتا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ "ہر ایک ناکام عاشق افسانہ نگار نہیں بن سکتا۔ مگر اس کو افسانہ نگار بنانے میں اس کی محبت کی ناکامی بھی مدد کر سکتی ہے۔"

اسی لیے میں نے اپنے قلم کا رینگنے کے تین اسباب بتائے ہیں۔ ان تینوں کو اپنے ذاتی معاملے سے ہٹا کر ایک عام اصول کی طرح بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔ ادب کی تخلیق کے لیے تین محرک ہوتے ہیں 'صفت کی اپنی انفرادیت اور خودی اس کے اپنے جذباتی تجربے اور اس کا ماحول' اقتصادی اور سیاسی ماحول۔"

میں نے کہا۔ تم اپنی کہانیوں اور ناولوں میں سماجی معاشی اور سیاسی ماحول پر اتنا زور دیتے ہو، شاید اسی لیے لوگ کہتے ہیں "تم نرمے جرنلسٹ ہو" ادیب نہیں ہو۔"

میرے تخلیقات پر لوگ جو سبیل چاہیں لگائیں مگر وہ یہی ہیں (اور وہی ہو سکتی ہیں) جو میں ہوں اور میں جو بھی ہوں اس کی پرورش ایک انسان اور اس کی سماجی تحریکوں سے ہوئی ہے۔ انسان کا کردار ہی نہیں بلکہ اس کی قسمت بھی داخلیت اور خارجیت دونوں ہی اجزاء کے ملنے سے بنتی ہے۔ اور اس سچائی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا خواہ وہ مارکس کا چیلہ ہو یا فرائیڈ کا پیرڈ، بھلا کون کہہ سکتا ہے کہ زندگی کی بناوٹ میں جذبات و احساسات کا تاثر زیادہ اہمیت رکھتا ہے یا معاشیات کا یا ماحول؟

اب میں اس کی باتوں سے خاصا بدمعاش ہو چکا تھا اسی لیے میں نے انٹرڈیو کا آخری سوال پوچھا۔ "کیا تم اپنی زندگی کا کوئی ایسا واقعہ بتا سکتے ہو جس کا بہت بڑا اثر دار و خیالات پر گہرا اثر پڑا ہو؟"

ایسے تو بہت اردو واقعات ہیں۔ ہر ایک کی زندگی میں ہر روز کوئی نہ کوئی چھوٹی موٹی واردات ہوتی رہتی ہے۔ جو بظاہر ہم بھول جاتے ہیں مگر دماغ پر نقش چھوڑ جاتی ہیں۔ ان سب کو یاد کرنے اور بیان کرنے کے لیے تو پوری کتاب چاہیے۔ پھر بھی وہ فوجی پریڈ والا واقعہ تو میں بتا ہی چکا ہوں۔ ایک اور سنائے دیتا ہوں۔ چاہو تو اسے ایک کہانی سمجھ لو مگر یہ ایک سچی کہانی ہے۔ جس کا عنوان ہے۔۔۔ "اندھیرے کا بھرا ہوا ستمبر یا اکتوبر ۱۹۴۷ء" آزاد ہندوستان اور آزاد پاکستان میں خون کی ہونی کھلی جا رہی تھی۔ شیواجی پارک کے علاقے میں جو چند مسلمان خاندان رہتے تھے وہ سب اپنے اپنے گھر چھوڑ کر محفوظ مسلم علاقوں میں چلے گئے تھے۔ صرف میں اور میری بیوی بچی اپنے سمندر کے کنارے والے فلیٹ میں اکیلے رہ گئے۔ کیونکہ ہمارا خیال تھا کہ اپنی جان بچانے کے لیے مسلم علاقوں میں جانا پاکستان جانے کے برابر ہے اور ہم پاکستان جانے کے لیے تیار نہیں تھے۔

چند جماعتی سوراخوں اور لگی مجاہدوں نے کوشش کی کہ ڈراؤں کا کر سہیں بھی مجبور کیا جائے کہ وہ علاقہ چھوڑ دیں، لیکن مجھے نے (جو اب اس دنیا میں نہیں ہے) کہا اگر شیواجی پارک میں زندہ رہنا ہمارے لیے ناممکن ہے تو پھر زندہ رہنا بے کار ہے، اور اس لیے ہم وہیں رہے۔ میں ان دنوں بچے کو نکلنے میں کام کر رہا تھا۔ ایک رات کو میں دادر کے اسٹیشن پر ریل سے اترا دیکھا کہ بازار سب اندھیرے اور سنسان ہیں۔ کرفیو لگا دیا گیا ہے اور نو بجے کے بعد کسی کو گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس وقت تقریباً پونے نو بجے تھے۔ میں نے جلدی ملبہ قدم اٹھائے تاکہ کرفیو کے وقت سے پہلے اپنے گھر پہنچ جاؤں۔

راستے میں دادر کی ایک اندھیری گلی میں سے گزر رہا تھا کہ میں نے محسوس کیا، کوئی پیچھے چلا آ رہا ہے۔ (میں فطری طور پر کوئی بہاؤ نہیں ہوں۔ اگر میں اس خطرناک زمانے میں اندھیرے اجالے میں اس طرح گھومتا تھا تو اس میں بہادری سے زیادہ مذکورہ دخل تھا) میں نے سوچا آج میری موت آگئی، مگر اب تو بھاگنے سے بھی کوئی فائدہ نہیں۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے قدم دھبے کر دیے اور جب مجھے محسوس ہوا کہ وہ بالکل میرے قریب آ گیا ہے میں ایک دم ٹھہر کر مڑا۔ ایک لمحے کے لیے وہ بے چارہ ڈر کر ٹھٹھک گیا کہ شاید میں اس پر حملہ کرنے والا ہوں۔

اس کو اطمینان دلانے کے لیے میں نے پوچھا۔ "کیوں؟ کرفیو لگا ہے کیا؟"

اس نے کہا۔ "ہاں، نو بجے کا کرفیو ہے ادھر، مگر شیواجی پارک میں نہیں ہے۔"

پیدا ہوا تھا، پانی بت جواب بھی ہندوستان میں ہے۔ میرے پرانا نا تھے خواجہ الطاف حسین حالی جن کی 'مسکس حالی' کے تین سوائڈ لیشن چھپ چکے ہیں لیکن جنہوں نے اپنے لیے یا اپنی اولاد کے لیے اس کی رائٹنگ کا ایک پیسہ نہیں لیا، کیونکہ وہ کتاب انہوں نے قوم کو بگکانے کے لیے لکھی تھی، اس کی بکری سے پیسے بنانے کے لیے نہیں۔ اور میرے والد تھے خواجہ غلام السبطین جنہوں نے مجھے سچ بولنا سکھایا۔ "کسی کے سامنے سر نہ جھکانا سکھایا۔ (ایک بار جنہوں نے مجھے گھر کے ملازم لڑکے کو آٹو کا پٹھا کہنے کی یہ سزا دی تھی کہ اس وقت تک کے لیے اندھیرے کمرے میں بغیر کھانا پانی کے بند کر دیا تھا جب تک کہ میں نے اس لڑکے سے ہاتھ جوڑ کر معافی نہیں مانگی تھی۔ اور اس طرح مجھے سمجھایا تھا کہ سب انسان برابر ہیں کوئی ادنیٰ یا کوئی نیچا نہیں ہے) اور جنہوں نے مرتے دم تک میرے لیے کوئی جائداد نہیں چھوڑی تھی، سوائے انسانیت کے چند اصولوں کے اور میری والدہ تھیں 'مسرورۃ النساء' جنہوں نے اسکول یا کالج میں تعلیم نہیں پائی تھی، کسی سیاسی پارٹی میں شریک ہوئی تھیں، لیکن جو آخری دم تک اپنے ملک ہندوستان کی وفادار رہیں۔ مگر میں اپنے خون کے رشتہ داروں کی ہی اولاد نہیں ہوں، میں اپنے ملک اور قوم کی بھی اولاد ہوں۔ گاندھی اور تہرہ کے خاندان سے ہوں اور انسانیت اور سوشلزم کے ناطے سے میری رشتہ داری ساری دنیا میں ہے اور جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے وہ مجھ پر (اور ہر شخص پر) اثر انداز ہوتا ہے، کیونکہ ایک یورپی شاعر جان ڈان نے کہا ہے:-

کوئی انسان جزیرہ نہیں ہے

ہر انسان سمندر میں ایک قطرہ ہے

ہر انسان زمین کا ایک ذرہ ہے

ہر انسان کی موت میری موت ہے، کیونکہ میں اور انسانیت جدا جدا نہیں ہیں۔

یہ کہہ کر آخر کار وہ خاموش ہو گیا۔

تب میں نے کہا۔ بے شک ساری انسانیت بہت ارے اندر سمائی ہوئی ہے لیکن بہت بھولو کہ اور کسی سے زیادہ تم پر میرا حق ہے۔ اگر تم نے کبھی مجھے اپنے آپ سے جدا کیا تو تم کو ڈرڈل میں صرٹ ایک اکائی رہ جاؤ گے۔ انسانیت عظیم ہے کیونکہ ہر انسان کی روح ایک ہے۔ کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ کسی میں وجدان بھی ہے، خدا بھی ہے، لیکن تم بھی اتنا تو مانو گے کہ ہر روح اور ہر ذات میں ایک 'خودی' ہے۔ یعنی تم میں میں ہوں جیسے مجھ میں تم ہو۔

یہ کہہ کر میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور اس نے میری آنکھوں میں اور پھر وہ میری نگاہ میں اس طرح سما گیا جیسے میں 'اور وہ' کبھی الگ ہوئے ہی نہیں رہتے۔

نکات و رقعات

غالب کا ایک نادر مجموعہ

مرقاۃ: اکبر علی خاں

غالب نے یہ کتاب انگریزوں کو فارسی سکھانے کے لیے لکھی تھی۔ اور ان کی زندگی میں ہی اس کو حکومت کی جانب سے شائع کیا گیا تھا۔ یہ کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی تھی جس پر غالب کو ایک بار گورنر کے دربار میں خلعت سے بھی نوازا گیا تھا۔ اس غیر معروف کتاب کو اب تعارف اور ضروری حواشی کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ کتابت، طباعت اور ترتیب و تہذیب کی طرف خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ اس لیے یہ کتاب ظاہر و باطن دونوں حیثیتوں سے صاحبان ذوق کی توجہ حاصل کرے گی۔

قیمت ڈھائی روپے

نگار بک ایجنسی رامپور یوپی

اب ہم دونوں ساتھ جا رہے تھے۔ مگر نکلیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے جا رہے تھے۔
 "کیوں بھی تم کہاں جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔
 "شیواجی پارک" اور تم؟
 "میں بھی شیواجی پارک۔"
 "دباں رہتے ہو کیا؟"
 "ہاں"

"کون ہو تم؟ نام کیا ہے تمہارا؟"

میں اس سوال کا انتظار ہی کر رہا تھا اور اس سوال سے ڈر بھی رہا تھا۔ اب کیا جواب دوں؟ میرا نام گوپال راؤ ہے یا سوہن لال کر
 یا سنت ڈلیا ہے اور اگر اس نے جرح شروع کر دی اور بھانڈا پھوٹ گیا تو؟ یا یہ کہوں تم کون ہوتے ہو میرا نام پچھنے دے؟ اس سے تو
 اسے شک کیا یقین ہو جائے گا کہ اپنا نام چھپا رہا ہوں۔

لہذا میں نے کہا۔ میرا نام احمد عباس ہے خواجہ احمد عباس۔

اس نے کہا۔ تم پیپر میں کام کرتے ہو؟

میں نے کہا۔ ہاں بمبئی کرائیکل میں۔

اور تم ابھی تک شیواجی پارک میں رہتے ہو۔

میں نے کہا۔ ہاں کئی برس سے ہم یہیں رہتے ہیں۔

اور اتنے میں پولیس کی ایک ٹولی کسے پاس سے گذر کر ہم شیواجی پارک والی سڑک پر آ گئے۔ یہاں کوئی نہیں تھا۔

میرے ہمراہی نے کہا۔ ٹینک میں چل رہے ہو عباس بھائی؟

میں نے پوچھا کونسی ٹینک؟

"حفاظت کمیٹی بنا رہے ہیں۔ سب شیواجی پارک میں رہنے والے اکٹھے ہوں گے۔"

"میں نے کہا تو ضرور چلتا ہوں۔"

ہم اکٹھے اس جلوس میں داخل ہوئے تقریباً "سوسو سو آدمی موجود تھے۔ جن میں سے زیادہ تر مجھے جانتے تھے۔ آؤ آؤ عباس بھائی
 چاروں طرف سے آوازیں آئیں۔

تجویر پیش کی گئی کہ اپنے علاقے میں امن قائم رکھنے کے لیے ایک حفاظت کمیٹی بنائی جائے۔ کمیٹی کے نمبروں کا چننا ہوا۔ پہلا نمبر جس کو
 چنا گیا اس کا نام تھا۔ خواجہ احمد عباس۔

اور جن لوگوں نے میرے نام پر ہاتھ اٹھائے ان میں وہ بھی تھا جس کو چند منٹ پہلے میں اپنا قاتل سمجھ رہا تھا۔ میں نے سوچا جلے
 کے بعد اس سے ملوں گا۔ مگر جلے کے ختم ہونے پر جو افراتفری ہوتی ہے اس میں وہ کھو گیا۔ اور آج تک مجھے اس کا نام نہیں معلوم مگر اس آدمی
 نے میری زندگی کے ایک نہایت نازک موقع پر انسانیت میں میرا یقین پختہ اور اٹل کر دیا۔

اور اپنی یادوں کے اندھیرے میں اب بھی اس گناہم انجانے ہمراہی کی قدموں کی آواز سنتا ہوں۔ اور جب میں مڑتا ہوں اور
 آٹھ سانس لے رہا ہوں تو اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔

"کون ہو تم؟ کیا نام ہے تمہارا؟"

اور میں بے خوفی اور کسی قدر فخر سے جواب دیتا ہوں۔ احمد عباس۔ خواجہ احمد عباس جو انچاس برس ہوئے پانی پت میں

خواجہ احمد عباس راجندر سنگھ بیدی کی نظر سے۔

خواجہ احمد عباس میرے دوست نہیں۔ ان معنوں میں جن میں کہ دوست ہوتا ہے اور یا میرے خیال سے اسے ہونا چاہیے۔ مجھے اس بات کا فکس ہے کہ میں نے ہمیشہ انھیں اپنا بزرگ اور پیش رو سمجھا اور یوں عزت کرتے ہوئے مثال دیا۔ کچھ اسی طرح کا برتاؤ انھوں نے بھی میرے ساتھ کیا میرے ادبی کارناموں پر کئی بار میری پیٹھ ٹھونکی، لکھ کر تحریروں کے ذریعے بھی مجھے تسلیم کیا اور اس کے بعد کمال باہر کر دیا۔ حال ہی کی بات ہے جب کہ میں نے انھیں اپنے یہاں دعوت دی تو بے تکلف انھوں نے مجھ سے پوچھا تم کہاں رہتے ہو؟ عباس صاحب کا سردنی دوست اور راز داں ہونے کا فخر بھی مجھے مسترزا ہوا، جس میں اگر کچھ میرا فخر ہے تو کچھ ان کا بھی۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے میری طرح دوستوں کا انتخاب سوچ سمجھ کر نہیں کیا۔ صاف اور صحیح طور پر کسی صحیح آدمی کو قریب لانے کی کوشش نہیں کی۔ جی ہاں صحیح آدمی کے سلسلے میں اگر میرا اشارہ اپنی طرف ہے تو چند دوسرے لوگوں کی طرف بھی جو اپنی ناقذانہ نظر سے عباس صاحب کے لیے مفید ہو سکتے تھے اور خود بھی کچھ نہ کچھ ان سے سیکھ سکتے تھے۔ جو بھی ان کے پاس آیا انھوں نے آنے دیا۔ یہی نہیں جو ان کے پاس سے گیا اسے جانے بھی دیا۔ پاس آنے والوں میں کچھ تو پہلے ہی قابل اور معزز تھے اور اگر نہیں بھی تھے تو عباس صاحب کے پرفیس اور مہذب برتاؤ نے ہمیشہ کے لیے انھیں بنادیا۔ اور جانے والوں کا تو ذکر ہی کیا۔

عزت کے سبب پیدا ہونے والی دوری اور غیریت کے باوجود میں کہہ سکتا ہوں کہ کم از کم مجھے ان کا ہم خیال ہونے کا فخر حاصل ہے۔ جس سے قربت اور دوستی کہیں دور کی بات نہیں ہے۔ پھر فقور اُجاٹے والے میں اتنا احساس تو ہوتا ہی ہے کہ وہ کسی کو جاننے کا پکا دعویٰ نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے اس کے ساتھ رہنے والا اس سلسلے میں بڑی بونگی اور عجیب باتیں کرتا ہے جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جو آدمی بقدر قریب ہوتا ہے اتنا ہی دور بھی

زندگی میں کم ہی آدمی آپ نے ایسے دیکھے ہوں گے جن کی شکل پیدائش سے لے کر آخری دم تک ایک ہی سی رہی ہو جس کی درجہ سے وہ بہت سے جرائم سے بچ جاتے ہیں۔ میں نے عباس صاحب کو ان کے بچپن میں تو نہیں دیکھا لیکن اپنی فریاد و جی کی حدود قابلیت کے سہارے یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت بھی عباس صاحب اپنے اس لائبریری ایڈیشن کا پیپر بیک رہے ہوں گے، اور کچھ نہیں تو گزشتہ پچیس برس سے تو میں ان کا منہ دیکھ رہا ہوں۔ جہاں قابلیت اور ذکاوت میں ان کا قدر بڑھتا ہے جہاں طور سے آپ دہلی کے دہلی رہے ہیں۔ چہرے پر جس تخیل و تفکر کے نشانات پہلے تھے وہی اب بھی ہیں۔ ویسے ہی نگاہ اچٹ کر سامنے والے پر پڑتی ہے۔ وہی مونچھوں کی ہلکی سی لکیر جس کے نیچے تیلے سے ہونٹ جو ناراضگی یا کھیاے ٹھوں میں کچھ اس طرح سے حرکت کرتے ہیں کہ نہ تو انہیں پھر دہلی کہا جاسکتا ہے اور نہ بھینچنا۔ ان کی منہ بے ساختہ مگر لہجہ جیسے استعمال کرتے ہوئے ایک دم رک جاتے ہیں۔

منجیدہ آدمی کو زیادہ ہنسنا نہیں چاہیے۔ سر کے بال پہلے ڈھالی تھے اب دورہ گئے ہیں۔ اس کے باوجود سکھوں کی مخالفت نہیں۔ بلکہ کئی دفعہ انھیں یوں نے کسی سکھ کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے پایا ہے۔ پوشاک میں سادگی ہے اور شریفانہ نمونہ برقی بھی ان کے اٹھنے، بیٹھنے، چلنے، پھرنے کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ زندگی میں ان کا رجحان بنادٹ پر نہیں کچھ اور ضروری باتوں پر ہے جن میں ادب، جرنلزم، علم سیاست اور دوسری بیسیوں مٹم کی سماجی ذمہ داریاں شامل ہیں۔ دنیا کے موجودہ سیاسی نظام میں اگر انھیں اسرائیلی اور متحدہ عرب جمہوریہ کے درمیان کسی ایک کو منتخب کرنے کا حق دیا جائے تو وہ یقینی طور پر عرب جمہوریہ کو چنیں گے۔ صدر جمال عبدالناصر کی پیردی

میر نے عباس صاحب کو پہلی بار لاہور میں دیکھا، وہ اپنے بزمِ دوست ساتھ کے ساتھ کوئی فلم بنانے کے سلسلے میں آئے تھے۔ یہ دونوں دوست انڈین پیپلز ٹیلیوژن کی سٹریکچر کا حصہ تھے جس کا ایک جلسے میں، میں عباس صاحب کو دیکھنے چلا گیا۔ ان دنوں لاہور کے لارنس باغ میں ایک نیا ادپین ایر ٹیلیوژن قائم ہوا تھا جہاں کافی ہنگامہ تھا، معلوم ہوتا تھا کچھ نہیں تو چھوٹا موٹا کچھ ضرور ہے۔ چنانچہ عباس صاحب کو دیکھنے کے سلسلے میں مجھے خوب دھکے کھانا پڑے۔ خیر دھکوں کی بات چھوڑیے، وہ تو زندگی کا بھہہ میں، ہم سب دھکے کھاتے ہیں، کبھی مل کر اور کبھی الگ۔ الگ۔ ایک مرتبہ پہلے بھی جب لاہور کے بریڈل ہال میں شاعر اعظم ٹیگور کو دیکھنے گیا تھا، تو اس سے بھی بڑا سلوک ہوا۔ بھاگ دوڑ میں سیکڑوں پیروں کے نیچے ردِ ننگی اتی بھی میر نے یہی سوچا تھا۔ کیا کسی بڑے آدمی کو دیکھنے کے لیے خود چھوٹا ہونا ضروری ہے؟ اس جلسے میں عباس صاحب ایک اہم تشریفات رکھتے تھے، اس لیے سنیں کہ باقی دوسرے فضول اور بے کام قسم کے لوگ تھے، ان میں عورتیں بھی تھیں اور عباس صاحب سب سے ملتے۔ سب سے باتیں کرتے پھر رہے تھے۔ جسے صحافتی زبان میں کہا جاتا ہے۔ کہ وہ آزادانہ مہمانوں میں گھومتے اور ان سے ملتے جلتے رہے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عباس صاحب کسی کی دل شکنی نہیں چاہتے تھے۔ ایسا کریں گے تو اپنا دل ٹوٹ جائے گا۔ اس کام میں ہمیں کتنا ہی بولنا، کتنا ہی دقت۔ برباد کرنا پڑا وہ اس بات کو بھول ہی گئے۔ اور شاید آج تک بھولے ہوئے ہیں کہ جب تک وہ کسی کا دل نہیں توڑیں گے بات کیسے بنے گی؟ دل بدست اور کہج اکبر است

تب بھی عباس صاحب کے چہرے پر ایسا اطمینان جھلکتا تھا کہ جس سے پتہ چلتا تھا کہ بعد کو وہ آزاد قلم ہو جائیں گے اور فلموں میں رہے تو آزاد قلم۔ ان کے چہرے پر سب سے اد پر شگفتگی ارادہ اور آزاد پسند ہونے کے نشان تھے۔ اس سے نیچے پی۔ سی۔ جوشی کی پادری لائن اور پھر سب سے نیچے مہانتا کا ندھی کی تلاش حق جو سرتاپا پوری کی پوری یکدم سب سے اد پر چلی آئی تھی۔

اس دن تجھ پر یہ راز افشا ہوا کہ کسی آدمی کی بڑائی سے بچنے کے لیے اس سے ذاتی طور پر ملاقات کر لینا ضروری ہے۔ اسے چھو کر دیکھنا لازمی ہے۔ خواہ وہ ہاتھ لانے کی صورت میں ہی کیوں نہ ہو۔ ایسا کرنے سے اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ وہ بھی ہماری ہی طرح کا انسان ہے۔ صرف اس نے زندگی کے کسی خاص شعبے میں حد سے زیادہ محنت و مشقت کی ہے۔ اور ہم نے نہیں۔ اگر ایسا کریں گے تو ہم بھی ان سے ہاتھ لاسکتے ہیں۔ در نہ ہم اپنے دل میں ایسے شخص کو کچھ ایسی احمیت اور حیثیت دے دیتے ہیں کہ وہ خواہ مخواہ ہمیں "بادن اوتار" یا نوگز کا معلوم ہونے لگتا ہے۔ پھر اسے انسان کی شکل و صورت میں دیکھ کر، عام آدمیوں کی سی حرکتیں کرتے ہوئے ہمارا سارا طبع لٹ جاتا ہے۔ جس میں اس بے چارے بڑے آدمی کا تو کچھ بگڑتا نہیں، ہمارا اپنا قد پہلے سے بھی چھوٹا ہو جاتا ہے۔ عباس صاحب سے معاملے کے بعد کم سے کم ایک بات کی تسلی تو ضرور ہوئی کہ جسمانی طور سے ان کا قد تجھ سے بڑا نہیں۔ البتہ رنگ گورا ہے۔ لیکن کبھی تو افریقی ممالک۔ بھارت۔ بنگالہ۔ اور گورنوں کا ہوا اتار پھینکیں گے۔ (چنانچہ آج میری پیشین گوئی کس قدر صحیح ثابت ہو رہی ہے) رہی قابلیت کے تد کی بات، درزش سے وہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔

ان دنوں عباس صاحب نے ابابیل نام کی ایک کہانی لکھی تھی۔ جس سے میں بہت مرعوب ہوا تھا۔ لایم اور فلا ہارٹی نے پرندوں کے بارے میں کچھ اچھی کہانیاں لکھی تھیں، لیکن عباس صاحب کی کہانی ابابیل ان سب سے فوق تھی۔ جب میں ڈاک خانے میں باجوہ تھا اور میرے نزدیک لاڈلہٹ پر مبنی آرڈر بک کرنے والے سے لے کر عباس صاحب تک سب انگریز داس راءے کی ایجوکیشن کو سنل کے پیرنٹس چنانچہ میں نے ہلکاتی ہوئی زبان سے کہانی کی تقریباً شتر دہائی۔ عباس صاحب خوش تو ہوئے لیکن پھر بڑے اچھے طریقے سے ٹال گئے اور میری کہانیوں کی باتیں کرنے لگے۔ امد میں معمول ہی گیا کہ ابھی مجھے ان کی ایک اور کہانی ایک پائلے چادل کی بھی تقریب کرنا ہے۔ میں خود بھی اپنی کہانیوں کی باتیں کرنے لگا۔ کہ عاجزی اور خاکساری میرے واسطے بڑی دل خوش کن بات تھی۔

جیسے عباس صاحب کی تعریف میرے نزدیک ایک بہانہ تھی، اپنی باتیں کرنے کے لیے، جب میں عباس صاحب سے مل کر آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس وقت انجانے طور پر انھوں نے اپنی عظمت کا کچھ حصہ مجھے بھی دیدیا ہے۔ میں گو تو نہیں ہوا مگر لباً ضرور ہو گیا ہوں۔ اندر یہ بات عباس صاحب میں خاص بات ہے۔ معنفوں میں (میرے سمیت) کم آدمی ایسے ملیں گے جو اپنی باتیں کم کریں اور دوسروں کی زیادہ۔ ایک دوسرا آدمی جو لوگوں کو دیکھنے میں خود ناراض ہو جائے وہ ہے 'اپندرنا تھو اشک' میں جب بھی ان دوستوں سے ملا ہوں پتہ چلتا ہے کہ آسمان ادب پر کوئی سیاستارہ نمودار ہوا ہے۔ یہ اس کی چرچا کرتے ہیں، اس کی ہزیریں پڑھ کر سناتے ہیں۔ یا پڑھواتے ہیں۔ کھوڑی سی بحث کے بعد مان بھی جاتے ہیں کہ وہ سترہ اسی طبع ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ صرف یہ نکلتا ہے کہ میں خون، محض خون کے جذبے سے اس ادیب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ کیونکہ ڈر کوئی پارٹنر (جذبہ نہیں ہے)۔ اس لیے وہ ادیب مجھے یا تو 'ٹائلٹ' اور 'چھوٹ' سے جی بڑا معلوم ہونے لگتا ہے یا پھر اپنے سے بھی چھوٹا۔ میری طرح کے جاگیردارانہ خیالات رکھنے والے ادیب بھی بہت سے ادیب ہیں۔ لیکن ایک فرق ہے۔ میں اپنی اس اس کمزوری کو جانتا ہوں اور اسے دور کرنے کی کوشش بھی کرتا ہوں۔ لیکن ان میں سے زیادہ تر نہ جانتے ہیں اور نہ کوشش کرتے ہیں۔ خیر وقت بڑے بڑوں کو ٹھیک کر دیتا ہے۔ اندر میں اپنے آپ سے مایوس نہیں۔

یہ بات نہیں کہ عباس صاحب اور 'اشک' میں خودی نہیں، ارے صاحب ہے، اندر بہت ہے۔ لیکن اتنی جتنی کہ تخلیق کے لیے ہونا چاہیے۔ اندر وہیں جہاں اسے ہونا چاہیے۔ عباس صاحب میں خودی اتنی ہے جس میں وہ اپنی ذات کو پہچان سکیں۔ دوسروں سے الگ، اور دوسروں کے درمیان۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے بہت سے ادیب درست لکھاؤ ہی بہت ہیں۔ میں نے عباس کی بہت سی کہانیاں پڑھی ہیں جن میں سے کچھ یاد ہیں اور کچھ بھول گیا۔ بھول جانا شعور کے سلسلے میں رائے ہو تو ہو لیکن انسانی دماغ ایک کمپیوٹر نہیں۔ اس سے بہت بلند ہے۔ جس کی تفصیل یا بحث اس گفتگو کا حصہ نہیں۔۔۔۔۔ عباس صاحب کی کہانی ۱۲ بجے 'تو بھول ہی نہیں سکتا' ایک تو اس لیے کہ اس سے میرا سیدھا تعلق ہے مگر چھ میں دائرہ ہی منہ دانے اور سگریٹ پینے والا سکھ ہوں) دوسرے اس لیے کہ یہ کہانی پنجاب کے فسادوں سے متعلق تھی جن میں سے میں بھی گزرا ہوں اور ریل کی چھت پر بیٹھ کر ننگے بدن پارٹیشن کے وقت مندرستان پہنچا ہوں۔ اس کہانی میں عباس صاحب نے اپنے ہی ڈھنگ کے حساب میں برابر کے سکھ اور مسلمان مارے تھے لیکن اس پر بھی سکھوں کی تسلی نہ ہوئی۔ اندر مجھے اپنی قوم کیساتھ غداری کرتے ہوئے عباس صاحب کے حق میں گواہی دینا پڑی۔ آخر میں عباس صاحب کی جان بچ گئی۔ اب آپ نے بھی عباس صاحب کو پڑھا ہے، ان کی فلمیں دیکھی ہیں، آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ میں نے اچھا کیا یا بُرا؟

تب تک عباس صاحب انڈین پیو پز تھپیٹر کے دوسرے ساتھیوں سے مل کر ہندوستانی فلم کا کلاسک دھرتی کے مالِ بنا چکے ہیں، نہ صرف یہ کہ دھرتی کے لال پہلی ہندوستانی حقیقت پسند فلم تھی بلکہ اس نے اپنے ملک کے سوائے ہوائے لوگوں کو تھپیٹر اور دوسرے ممالک کے لوگوں کو اس ٹریجڈی کی طرف متوجہ کیا۔ جس کا نام اس زمانے کا ہندوستان تھا۔ آج کل کی بھی تخلیق ہو چکی تھی۔ اس میں بھی عباس صاحب کی ان کہانیوں اور نادوں کے مانند ایک پیغام تھا جو تائید کے بعد پیغام نہیں رہ جاتا، آدمی کو چڑھا دیتا ہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو بد صورت نہیں سمجھتا چاہتا، 'انہونی' پہلی غیر جانب دار تصویر تھی جو بہت حد تک کامیاب رہی۔

بٹوارہ کے بد میں بھٹی چلا آیا تو اکثر عباس صاحب سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ہماری ترقی پسند تحریک ان دنوں شباب پر تھی عباس صاحب اس کے رہبر تھے اور رہ رہتی رہی۔ کبھی انھیں اس تحریک میں زیادتی معلوم ہوتی تھی اور اکثر لمبی۔ مجھے وہ ان یاد ہے جبکہ غریبوں اور بے کسوں کے لیے ایک پرہیزگار کی حد تک شور مچانے والے عباس صاحب کو پارٹی منشور مطابق تحریک سے معزل کر دینے کی کوششیں ہونے لگیں تب میں نے عباس صاحب کو اس قدر غصہ کی حالت میں دیکھا جب ان کے ہونٹ بھنج بھی رہے تھے اور ہنر پھرا

بھی رہے تھے۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ تیزی سے باتیں کیے جا رہے تھے، آواز جو پہلے ہی کھسپائی ہوئی تھی، اور کھسپا گئی۔ لیکن پانی پتی ہونے اور خود کو پنجابی کہلانے کے باوجود عباس صاحب کے منہ سے ایک بھی لگائی نہ نکلی، کیونکہ وہ متذیب کا تقاضہ نہ تھی۔ ان دنوں ہم چور کار دل ادا کر رہے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ جس طرف بھی پڑا بھاری ہو جھک جائیں۔ کچھ سمجھتے اور طاقت کی کمی اور کچھ دماغی کنفیوژن، بس جو اسٹائن نے کہہ دیا وہی آیت ہے۔ کبھی کبھی محسوس بھی کرتے تھے کہ یہ سب کیا ہوا ہے جس میں بیٹھے ہوئے لوگ بہت قابل ہیں اور ہمیں سننے بغیر ہی ہماری منتہی کا فیصلہ کر ڈالتے ہیں، جس کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔ ورنہ آپ 'تخریک' سے الگ، حالانکہ آپ کی تخریک کا پارٹی سے کوئی تعلق ہی نہیں، کم از کم سیدھے سیدھے نہیں، اس پر مزہ یہ کہ غلط فیصلہ کرنے کی صورت میں بچ بھی نکلتے ہیں، کیونکہ وہ فیصلہ ایک آدمی کا نہیں، کئی بچوں کا ہوتا ہے۔ اور آپ تو جلتے ہی ہیں کہ بچوں میں بھگوان ہوتا ہے۔ پھر ہوشیاری کا یہ عالم کہ ان بچوں میں ایک ادیب سم کا بھی آدمی ہوتا ہے۔ ایسا آدمی جو ادب، آرٹ اور اس کے عوام کے لیے مفید یا مضرت رسا ہونے کی سب حدود جانتا ہے اور پھر اس میں اس قدر یو پیج بھی ہے کہ برسوں بعد پارٹی لائن کے غلط ہونے پر معافی بھی مانگ سکے۔ میں تو اپنی نا سمجھی اور کمزوری کی وجہ سے خوف زدہ تھا، لیکن دوسرے بھی خاموش تھی جو مجھ سے بھی زیادہ ڈر رہے ہوئے تھے وہ عباس صاحب کے منہ پر کھری کھری سناتے تھے اور بعد میں اس کی چرچا کر کے خوش ہوتے تھے اپنی ہمت پر خود حیران۔ لیکن عباس صاحب کو ان کی اور اپنی کوشش و محنت کے مقابلے میں اپنے جذبے پر بھروسہ تھا اس لیے نہیں کہ وہ اسٹائن سے لے کر کیفی اعظمی تک اپنے آپ کو زیادہ قابل سمجھتے تھے، بلکہ اس لیے کہ حقیقت پر سوچنے کے لیے ان کے پاس ایک ہی کسوٹی تھی۔ محبت۔۔۔۔۔ جسے صحیح آدمی کبھی کبھی خود بھی شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے اور سر کس کے کسی کھلاڑی کی طرح زندگی کے رستے پر اپنے آپ کو خیالات و جذبات کے درمیان متوازن و سنجیدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بہر حال اپنی آخری جا پتہ تجزیے میں وہی کسوٹی مقابلتا ٹھیک اترتی ہے، کیونکہ اس کے سامنے ادب اور سیاسی حساب کے وہ پیچیدہ سوال نہیں رہ جاتے اور نہ انسان کے سیدھے سادے مسائل کا حل اسٹائن ازم میں ڈھل پاتا ہے، اور نہ ماد کی طرح ہندوستان پر حملہ کے، تاکہ روس کو کان ہوں۔ چنانچہ ان تمام باتوں کے باوجود عباس صاحب کے قدم اپنے راستے سے نہ ڈگسکائے، لیکن تب تک کسی کہاوت کے موافق۔ 'بہت سا پانی ہماری ندیوں میں بہہ گیا تھا۔'

ہمارے بہت سے دوسرے دوستوں کی طرح عباس صاحب بھی اس ادب کے قائل ہیں جس کا کچھ مفقود ہو۔ اس سلسلے میں اگر کوئی دل اور دماغ دونوں کو لیکو کر کے اور ملا کر لایا تو نتیجہ اچھا نکلا۔ ورنہ محض آواز ہو کر رہ گیا، بلکہ شوز عباس صاحب کی کئی کہانیاں اور دوسری تحریریں ایسی بھی ہیں جو پراثر نہیں ہوتیں اور اگر ہوتی بھی ہیں تو کرداروں کے لحاظ سے انتہائی عینیت پسند اور وقتی پہلو لیے ہوئے ہوتی ہیں کہ جس کے سبب ان کی گونج جلد ہی ختم ہو جاتی ہے، لیکن ان کے اور دوسروں کے مفقود میں فرق ہوتا ہے، انھوں نے لڑکی کے سہارے تو ایک طرف لڑکی کے سہارے میں جنگ و انقلاب تک پہنچانے کی کوشش نہیں کی اور نہ اس میں بہت سے لوگوں کی طرح عزت ہوئے ہیں، نہ انھوں نے زبان و حسن بیان پر اپنے معنی کھتو پے ہیں، بلکہ اپنے مقصد کی تلاش میں کچھ اس طرح سیدھے گئے ہیں کہ ادھر ادھر بھی نہیں دیکھا۔ حالانکہ نظر دل سے راستے کی خوبصورتی اور وضع کو وسیع کرتے جانا آرٹ کی کارگیری ہے۔ ان کی بہت سی تحریریں پڑھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے عباس صاحب بہت جلد ہی ہیں، انہیں ایک ہی کام تو نہیں سیکڑوں ہیں، ان کے پاس وقت نہیں، اور زمانہ بے کرتیز سے تیز تر ہوتا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ اپنی رفتار قائم رکھنا ایک خالص سائنفلکٹ عمل ہے۔ میں اس بات کو فلسفہ کی سطح پر لاتے ہوئے یہ عرض کر دوں گا کہ وقت کو روکنا ہی پڑے گا۔ ورنہ ہم نہیں کر سکتے۔ جس طرح ہمارے بزرگوں نے خاموشی اختیار کر کے قوت گو پائی پر کنٹرول کیا تھا اور محویت اختیار کر کے بھگوان کی پکڑ سے بھی آگے نکل گئے تھے۔ اسی طرح کی کوشش ہمیں بھی کرنا ہوگی، ہم ادیبوں کا داسٹاک اور ہمارا راکٹ یہی ہے جس پر سوار ہو کر چاند اور سورج سے بھی

ادب پر جاسکتے ہیں۔ ایک دن آئے گا جب کہ فتنہ انگیز مادہ پرستی کے دعویداروں کو بھی مفسد کی ٹکیں اور اداس کی اندرونی محاسنوں کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

عباس صاحب کی نجی زندگی کے بارے میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ ان کی بیگم مرحومہ عجبی ایک نہایت خلیق اور پر خلوص عورت تھیں۔ ہم ادیبوں سے وہ بھائیوں کا سا سلوک کرتی تھیں۔ جو ہو، میں میرا ایک کمرہ ہوا کرتا تھا جہاں میں بیٹھ کر اپنا کام کیا کرتا۔ عباس صاحب کا مکان راستے میں پڑتا تھا۔ کبھی ان کے رکتا تو وہ بڑی شکایت کرتے کہ قریب سے گزر جاتے ہو اور آتے تک نہیں۔ ان کے انتقال سے ہمیں ہی اتنا دکھ ہے تو عباس صاحب کے بارے میں آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔

سیکس (sex) کے بارے میں عباس صاحب کا زادیہ نظر ایک نارمل مہذب آدمی کا سا ہے۔ وہ زندگی کے اس جز کو ایک م ذاتی سمجھتے ہیں، انگریزی کے ایک محاورے کے مطابق نہ تو وہ کسی کے گندے کپڑے ہلکے میں دھوتے ہیں اور نہ اپنے دھونے دیتے ہیں۔ مطلب اگر ان کے پاس ایسے کپڑے ہیں تو.....

ایک چیز جس نے عباس صاحب کے سلسلے میں مجھے ہمیشہ حیرت میں ڈال دیا ہے وہ ہے ان کی کام کرنے کی ایک عجیب و غریب طاقت۔ کہانی لکھ رہے ہیں اور ناول بھی۔ نیشلزم یا انٹرنیشنلزم کے موضوع پر مسلم بھی بنا رہے ہیں اور جرنلسٹ بھی بنے ہوئے ہیں۔ لمبیز کا آخری صفحہ تو ہر حال لکھنا ہی ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ فرد شجوف کی سوانح حیات بھی ہو گئی، پنڈت نہرو سے ملاقات کر آئے۔ جن سے ان کے پرسنل تعلقات ہیں۔ پھر وہ ۳۵ لاکھ کمیٹیوں کے ممبر ہونا سماجی ذمہ داری کا ثبوت ہے۔ اور یہ بات نمبر شپ تک ہی محدود نہیں ہر جگہ پوچھیں گے بھی، تقریریں کریں گے، پورے ہندوستان میں مجھے اس قسم کے حرف تین ہی آدمی دکھائی دیے۔ ایک پنڈت جواہر لال نہرو، دوسرے سمبلی کے ڈاکٹر بالیکا، اور تیسرے خواجہ احمد عباس، جن کی یہ طاقت اور سمیت ایک معمولی آدمی کی سی نہیں۔ چنانچہ جب میں نے ایک دفعہ عباس صاحب کے سامنے اپنے اس تعجب کو ظاہر کیا تو انھوں نے ہمیشہ کی طرح بڑی خوبصورتی سے ٹال دیا۔ اور بولے "تجلی تو ہر بات میں پتلا پن ہے" اور پھر مسکرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولے "آج کل کیا لکھ رہے ہو؟"

درمیان میں کسی نے ٹوک دیا اس لیے عباس صاحب نے میری آنکھیں نہ دیکھیں، جو غم ہو گئی تھیں۔ ان سے میری پہلی ملاقات اور اس ملاقات میں بیس پچیس برس کا وقفہ آچکا تھا اور میں اپنے بارے میں کم بات کرنا سیکھ چکا تھا۔

نگار دامپور

کے بارے میں یہ عام غلط فہمی ہے کہ اس کا تعلق نگار پاکستان سے ہے اور یہ اسی کا چریہ ہوتا ہے ہم ان دونوں باتوں کی پرزور تردید کرتے ہیں۔ نگار رام پور کا کوئی تعلق نگار پاکستان سے نہیں اور اس کے مضامین بھی بالکل علیحدہ ہوتے ہیں۔

نگار پاکستان کی خریداری کے لیے آپ منیجر نگار پاکستان ۳۲ گاندھی گارڈن کراچی ۳ کے پتے پر لکھیے۔
نگار رام پور کی خریداری کے لیے نگار بک اینجینی رام پور سے رجوع کیجیے۔

منیجر نگار دامپور

پاس بیکانہ کا مرتبہ

بحیثیت غزل گو

ملک اسماعیل حسن خاں

اردو غزل کے سارے قدیم و جدید سرمایے پر نظر رکھتے ہوئے اگر آپ صاحب طرز اور منفرد غزل گو شعرا کی انہر ایک فہرست مرتب کرنا چاہیں تو بڑی مایوسی ہوگی۔ یہاں انفرادیت کو میں نے صرف اسلوب اور لہجے تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اس کے معنویت اور غزل کی مخصوص رمزیت وغیرہ سب کچھ آگئی ہیں۔ گویا اردو غزل گو شعرا کی غزلیں فارسی کے غزل گو شعرا کی بھولی کھٹکی آواز باز گشت ہیں۔ جن کے اندر نہ تو فکر و خیال کی ندرت نظر آتی ہے اور نہ انداز بیان یا طرز گفتار کی انفرادیت۔۔۔ اگر اسکی وجہ دریافت کی جائے تو متحدہ وجہ سامنے آئیں گی۔ اور لوگ عجیب عجیب دلائل اور اسباب پیش کریں گے۔ لیکن اس جگہ مختصر الفاظ میں یوں کہنا جاسکتا ہے کہ ایک تو غزل گوئی محض اظہار کمالات اور استاد کی مظاہرہ کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی، ذہنی دشمنیں زیادہ اور خون جگر کی نمود کہیں کہیں ہی جھلک اٹھتی تھی، استادان فن مختلف قافیوں کو سلسلے رکھ کر ان پر مصرعے لگاتے اور کہتے چلے جاتے تھے اور بقول کسی کے وحدت میں کثرت کے نمائشے دکھاتے تھے۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں نے غزل پر غیر فطری صنف شاعری کا الزام لگایا، جو بڑی حد تک صحیح ہے۔ اس میں شاعر قافیوں کے سہارے آگے بڑھتا ہے اور دلی جذبات کا پیرل اظہار اس میں بس کہیں کہیں یا گنتی کے شعرا کے یہاں ہی دکھائی دیتا ہے۔ غزل میں یہ نہیں ہوتا کہ پہلے کوئی خیال یا جذبہ ذہن و قلب کی گہرائیوں میں پیدا ہو اور پھر شاعر اس کے لیے ایسے مناسب الفاظ قافیہ اور بحر و ردیف کی تلاش کرے جس سے بات کی اہمیت اور تاثر بڑھ جائے بلکہ اسٹی فی صدفی یہی ہوتا ہے کہ شاعر پہلے سے طے کر لیتا ہے کہ اسے فلاں زمین میں غزل کہنا ہے اور اس کے لیے جتنے قافیہ ذہن میں آتے ہیں ان سب کو نوٹ کر لیتا ہے۔ اور پھر ہر قافیہ کو بار بار ذہن میں گھماتا رہتا ہے۔ اور شعر کہتا جاتا ہے۔ غزل میں قافیہ جذبات و خیالات کے پابند نہیں رہتے۔ بلکہ قافیہ خیالات پیدا کرتے ہیں۔ غزل گو شعرا کے دوا دین کا اگر آپ غزل کی نظر سے مطالعہ کریں تو یہ حقیقت فوراً آپ پر واضح ہو جائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح غزل میں فطری جذبات اور دل کی محفل سے اٹھی ہوئی سچی آواز نہیں ملے گی۔ اور تصنع، مضبوطی اور بناوٹی مضامین اور پر تکلف انداز بیان ہی کی کار فرمائی نظر آئے گی۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ غزل گو شاعر خارجیت (ا) سے بالکل کام نہیں لیتا، وہ تو دار و دات قلبی کی تصویریں کھینچتا ہے۔ خارجی حالات اور خارجی کیفیات سے اسے کوئی مطلب نہیں، وہ تو دل کی دنیا میں محو ہے، دل پر گزرنے والی کیفیات ہی اس کی کل کائنات ہیں، اس کو صرف داخلیت (ا) ہی سے کام ہے اور داخلیت سے مراد وہی گل و بلبل، حسن و عشق، رقیب و معشوق، وصل و ہجر، خزاں و بہار، نزع و تربت، کفن و لاشہ، ناز و نیاز، شمع و پروانہ، جام و شراب، بوس و کنار وغیرہ کے رسمی و مذہبی تفسے ہیں، ان کو لپیٹ کر (ا) کی طرح اسی بات میں لطف ملت ہے کہ۔

تیر نے جب آراستہ پیراستہ باغ کا دریچہ کھولنا بھی پسند نہ کیا تو اردل کی دنیا میں محو مگن رہے تو دوسرے غزل گو دل سے باہر کی دنیا کی طرف کس طرح متوجہ رہ سکتے ہیں، اس لیے کہ تیر تو خدائے سخن تھے۔ جس نے تیر کی شاعری کی شریعت سے انکار کیا وہ کافر ٹھہرا۔
 ”آپ بے بہرہ ہے جو تنقید تیر نہیں“ جو شش نے بالکل صحیح کہا ہے۔

یہ فقط رسمی تقلد و فرہاد کے مرہبے ہیں آج تک معشوق پر اجداد کے
آج تک غالب ہے ان پردہ رقیب رویا کر چکا ہے زندگی جو تیر و تومن کی تباہ
پائی ہے تر کے میں ان لوگوں نے ہر لے ہردا ان کے لب پر بھی دی ہے جو دکی کے لب پر ہوتا

یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا میں کہہ رہا تھا کہ دل کی دنیا سے نکلے بغیر کام چلنا مشکل بھی ہے اور غلط بھی غزل میں جدت دلیے ہی مشکل
سے پیدا ہوتی ہے نہ یہ کہ شاعر مشاہدات و تجربات اور دوسرے (فارسی) رجحانات و میلانات کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لے اور محض
جد بات کے سہارے شاعری کرتا رہے تو ایسی شاعری معنی اور انداز بیان دونوں حیثیتوں سے کسی قدر کی مستحق نہیں قرار پائے گی۔ اس میں
تور پیدا ہو سکے گا۔ نہ عظمت اور اس طرح معنی اور انداز بیان کی بولمونی اور رنگارنگی اس سے منہ پھیرے رہے گی۔ حالی نے ہی لیے شاعر
اور شاعری کے لیے فردری شرائط میں ایک کائنات کے مطالعہ کی شرط بھی بیان کی ہے۔

پھر دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ غزل کے بعض بندے طے کے مضمون تھے شاعران ہی کو لوٹا پھیر کر انداز بیان بلکہ پینترے بدل بدل کر
پیش کرتے ہیں۔ اس طرح فکر و خیال کی ندرت اور مضامین کی جدت اور اس جدت سے پیدا ہونے والا تنوع و دہ کی آواز ہو کر رہ گیا۔
میرا مدعا یہ بالکل نہیں ہے کہ وہ غزل کے رمز و ایما یا بالفاظ دیگر غزل کے مخصوص آرٹ کو حدود کو توڑ کر نکل جاتے عرصہ یہ مفقود ہے کہ وہ ردائی
انداز کے چکر میں پڑ کر گل و بلبل اور صن و مجت کے موضوعات اور مضامین ہی کو حاصل کل سمجھ بیٹھے اس سے جہاں فکر و خیال کی ندرت
کو صدمہ پہونچا وہاں بات کہنے کے مختلف اسالیب بھی پردہ خفا میں مرموز رہے۔

اس وقت میں جدید غزل گو شعرا میں سے ایک شاعر کا مختصر طور پر ذکر کرنا اور اس کے کلام کی ان دو چار خصوصیات کی طرف اشارہ
کرنا مناسب خیال کرتا ہوں جو اس کی شاعری میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور اردو غزل کے لیے تقریباً نئی ہیں۔ قبل اس کے کہ
کچھ ذکر چھیڑا جائے مناسب یہ ہے کہ جدید غزل اور جدید غزل گو شعرا کے متعلق بھی محبہ کچھ عرض کر دیا جائے تاکہ بات زیادہ واضح ہو کر
سننے آ سکے۔

جدید غزل گو شعرا سے میری مراد وہ شاعر ہیں جن کی شاعری بیسویں صدی میں پر دان چڑھی اور داغ۔ امیر۔ حلال اور امیر المذللیم
کے بعد جن کی زمزمہ پر دازیاں سامع نواز ہوئیں۔ اور جنھوں نے غزل پر حالی کے اعتراضات اور اصلاحی تحریک کے بعد سے لکھنؤ اسکول کی اس
شاعری سے اقبنا کیا جہاں لفظی شعبہ بازی اور مصنوعی باتیں ہی سرمایہ کلام کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اور جہاں حقیقی جذبات و احساسات
صدا بھرا ہو کر رہ گئے تھے یا پھر غزل میں تاثیر پیدا کرنے اور رنگ و تہیم سے گریزاں ہونے کے لیے تربت۔ کفن۔ میت۔ لاش۔ نزع۔ گد غریب
وغیرہ مضامین کا نسخہ استعمال کیا جا رہا تھا ان غزل گو شعرا نے غزل میں مضامین اور انداز بیان دونوں لحاظ سے لکھنوی غزل سے احتراز کیا۔
اور اپنی غزل گوئی کی بنیاد پر سچے جذبات و تاثرات اور دل نشین اور متاثر کن انداز بیان پر رکھی اور غزل کو پھر سے مقبول بنانے کی کوشش
کی۔ اور وہ غزل کے احیاء سے یہی مراد ہے۔ لیکن غزل میں اس نئے پن کے باوجود ان غزل گو شعرا کے یہاں نئے نئے تغیر

اور نئے امکانات کی تلاش بے سود ہے ان کے یہاں سیاسی و سماجی احساس تقریباً مفقود ہے اس کا اندازہ اس مثال سے ہو سکتا
ہے کہ حالی اور جگر اقبال کو شاعر ہی ماننے کو تیار نہ تھے بلکہ ان کا قول تھا کہ وہ "ناظم یا داعظ تھا شاعر نہ تھا۔"

اس قافلے کے میر کار داں حسرت موہانی تھے جدید غزل کا جب بھی تذکرہ کیا جائے گا ان کی اسمیت اور خدمت کو کبھی نظر انداز نہیں
کیا جاسکتا۔ اب اس گرد و پیک غزل گو شعرا کے اسمائے گرامی ملاحظہ کیجیے تاکہ اردو مضاحت ہو سکے۔ اس فہرست میں دو ایک ناموں
کا اضافہ ہو سکتا ہے۔

شاد عظیم آبادی۔ ثناء قب لکھنوی۔ عزیز لکھنوی۔ ریاض خیر آبادی۔ فانی بدایونی۔ اصغر گوئد دی۔ حسرت موہانی۔ سائل دہلوی
بھجود دہلوی۔ یاس لگانہ چکیزی۔ دل شاہ جہاں پوری۔ جلیل مانچر دی۔ ناطق لکھنوی۔ ناظم گل دہلوی۔ تاجہ نجیب آبادی۔ بیاب اکبر آبادی

وحشت بکھیتی۔ صنفی لکھنوی۔ مائی جالسی۔ جگر مراد آبادی۔ آٹھ لکھنوی۔ فراق گورکھ پوری۔

جدید غزل گو شعرا میں پانچ شاعروں کو اہم ادرت و ادل کا شاعر سمجھتا ہوں۔ جن کی شاعری میں وہ آفاقیت کو چھوٹی ہوئی قدردی اور ابدیت کے وہ نقوش مل جاتے ہیں جن کے باعث ان کی شاعری مدت دراز تک زندہ اور قابل پسند رہے گی، بالترتیب ان کے نام یہ ہیں۔ ۱۔ قانی۔ ۲۔ اصغر۔ ۳۔ فراق۔ ۴۔ لگانہ۔ ۵۔ حسرت۔

حسرت کا نام باوجود ان کی خدمات اور کامیابی کے میں نے سب سے آخر میں یوں رکھ لیا ہے کہ ان کا دائرہ فکر بہت محدود ہے۔ وہ صرف حسن و عشق کے شاعر ہیں۔ یہی ان کا خاص رنگ اور میدان ہے۔ اور اس میں وہ بہت کامیاب ہیں۔ سردر صاحب کے بقول ان کا حسن و عشق ان کے ہجر و فراق سب اسی دنیا کی چیزیں ہیں۔ مگر انھوں نے ان میں ایک ابدی چاشنی بھر دی ہے اور زمان و مکان سے بے نیاز کر دیا ہے۔ انھوں نے حسن کو ایک آسمانی مخلوق سمجھ کر نہیں پوچھا اس کے لباس اس کی خوشبو اس کے سونے جلنے کی طرح جاری ہے اس کے اضطراب و کشمکش سے جانا پہچانا۔ حسرت نے اس فوش گوارا و رحمت من و عشق کا ذکر کیا ہے جو حسن کے عطف و کرم سے شاداب اور سرشار ہے۔ انھوں نے غزل کی عوامی اپیل بڑھادی مگر اسے شائستگی کے معیار سے داغ کی طرح گرنے نہ دیا۔ انھوں نے عشق سے اس کی تلخی و محرومی اس کی حرماں لیبی اور رسم پسندی چھین لی۔ اسی لیے غزل میں حسرت کا بڑا درجہ ہے۔

لیکن ان کے معنایں میں موضوعات میں کوئی تنوع نہیں۔ ان کا کینوس (بہت چھوٹا ہے) وہ اپنے دور کے مومن ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کا محض ایک رخ ہے۔ اور وہ ہے حسن و عشق۔ اس کا اندازہ اس مثال سے ہو سکتا ہے کہ ان کی ساری عمر سیاست کی گرم بازاری میں گزری لیکن اس کے باوجود ان کے یہاں اس کا اظہار صرف چند مقامات پر بالکل رسمی طور پر ملتا ہے۔ سردر صاحب نے "ادب اور نظریہ" میں ایک جگہ لکھ لیا ہے کہ غنائی یا عشقیہ شاعری جذبات کی گہرائی اور صداقت بہت کچھ سہی، مگر عشقیہ شاعری میں بھی بڑی شاعری محض عشق پر نہیں ہوتی۔ اور بڑی شاعری کے لیے خیالات کی بلندی یعنی تخیل کی قدرت اور کائناتی یا آفاقی رنگ ضروری ہے، یعنی عشق کو محض عشق نہیں زندگی بھی ہونا چاہیے۔ لیکن حسرت کی شاعری میں نہ تو خیالات کی بلندی ہی ہے اور نہ کائناتی یا آفاقی رنگ۔ وہ بڑی سطحی جذباتی اور ہلکی پھلکی عشقیہ شاعری ہے۔ اپنی شاعری کے متعلق خود ان کی ذاتی رائے یہ ہے :-

"میری شاعری میں اس قسم کی کوئی بات نہیں ہوتی ہے لیکن آپ کو اس کی طرف توجہ نہیں کرنا چاہیے۔ وہ ہوس ناکی کی شاعری ہے۔ اس کا مقصد تغنن اور تفریح ہے۔ آپ کا مقصد اس سے بلند ہونا چاہیے۔ آپ کو زندگی کے اہم اور جید مسائل کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔ شاید اسے کوئی انکساری پر محمول کرے لیکن حقیقت کچھ ایسی ہی ہے یہ ہوس ناکی اور تغنن و تفریح ہی کی شاعری ہے۔ غلیل الرحمن عظمیٰ نے ان کی شاعری کا تفصیلی جائزہ لے کر ان کے شاعرانہ مرتبے کا بڑا صحیح تعین کیا ہے، وہ لکھتے ہیں :-

۱۔ "حسرت کی شاعری کو میں نے جب بھی پڑھا ہے تو کسی ادبچی سطح پر پہنچنے کے بجائے ایک نارمل سی کیفیت محسوس کی ہے۔ ان کی بہترین شاعری بھی صرف وجدان کی رہین منت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ صرف وجدان کے سہارے آج تک کبھی بڑی شاعری نہیں ہوئی ہے، بڑی شاعری وجدان اور فکر دونوں کے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے۔

۲۔ "حسرت کی آپ بیتی" بھی ان کی پوری زندگی کا احاطہ نہیں کرتی۔ سولہ سے پچیس سال کی عمر میں ان کو عشق کا جو تجربہ حاصل ہوا اسی تجربے کی بنا پر وہ عمر بھر شاعری کرتے ہیں۔ اور انھیں جذبات کی کیفیات کو نظم کرتے ہیں جو عنفوان شباب میں پیش آتی تھیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ اس کا مقابلہ ہم اس شاعری سے کس طرح کر سکتے ہیں جس میں نہ صرف شاعر کی زندگی اور اس کے ارد گرد کا ماحول سمٹ آتا ہے بلکہ اس کی گرفت میں کائنات اور زمان و مکاں کی سرحدیں آتی ہیں۔

۳۔ "حسرت کی دوسری کی دوسری خصوصیت اس کا سادہ دماغ فہم ہونا اور بہت جلد متاثر کرنا ہے شعر کے متعلق ان کا یہ نقطہ نظر ہرگز

شعر دراصل ہے وہی حسرت سنتے ہی دل میں جواز نہ جاملیں

۵۔

ایک اچھے غزل گو کی حیثیت سے ان کی یہ خصوصیت بڑی قابل قدر ہے لیکن ان کی یہی خصوصیت ان کو بڑا بننے سے روکتی بھی ہے۔ سنتے ہی دل میں اتر جانے والے اشعار پسندیدہ ہو سکتے ہیں لیکن ان میں کوئی بڑی بات نہیں ہوتی، بڑے شاعر کا شعر ذرا مشکل سے سلا کے نیچے اترتا ہے۔

سرور صاحب نے گوئے اور کوثر جی کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "شاعری میں عظمت انکار کی گہرائی سے آتی ہے۔" لیکن حسرت کی شاعری بالکل سطحی اور سستی جذباتیت سے برز رہی ہے۔ سطح بالا میں طویل اقتباس کی ضرورت اس لیے پڑی کہ "اچھے شاعر اور بڑے شاعر کا فرق واضح ہو جائے اور حسرت کے شاعرانہ مرتبے کے متعلق کسی شک و شبہ یا غلط فہمی کا احتمال یا گنجائش نہ رہے۔ چونکہ یہ بات موضوع زیر بحث سے خارج ہے اس لیے اس کی تفصیل کا موقع نہیں، اب یگانہ کی شاعری کی بعض خصوصیات کی تشریح کی کوشش کی جائے گی۔

جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں، اردو میں ایسے شاعر بہت کم ہیں جو صاحب طرز ہوں یا کسی خاص انفرادیت کے مالک ہوں۔ تقلید نے منف غزل کو غیر فطری بنا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غزل ایک مخصوص دائرے میں محدود ہو گئی۔ انداز و خیال کی ندرتیں آواز کی انفرادیت کی جو بڑی اہم چیزیں ہیں معدوم ہوتی گئیں، اور کورانہ تقلید کا رجحان عام ہو گیا۔

صاحب طرز شاعروں کو اگر آپ شمار کرنا چاہیں تو دونوں باتوں کی انگلیوں پر گن سکتے ہیں، یہ تقلید مضامین اور انداز بیان دونوں جگہ جلوہ نکلتے ہیں۔ مثلاً صاحب طرز شاعروں میں تیر۔ غالب۔ انشا۔ داغ اور جدید غزل گو شاعروں میں قافی۔ آصفیہ۔ فراق۔ یگانہ کو شامل کر سکتے ہیں۔ اردو غزل کے سارے سرمایے کے سامنے یہ چند نام قابل انیسوس امر کا اظہار ہیں۔

یگانہ کے یہاں سب سے پہلی چیز جوانی طرٹ۔ متوجہ کرتی ہے وہ ان کا مردانہ عزم و اعتماد، کراماتین، کرکڑ کے انداز بیان اور لہجہ کی وہ کھٹک اور جھنک ہے جو متوجہ کرنے کے ساتھ قاری کو مرعوب کرتی ہے۔ اور قاری اس کو پڑھ کر ایک دم چونک جاتا ہے۔ یہ انداز انداز یہ لہجہ یگانہ سے قبل اگر ملتا ہے تو کہیں کہیں غالب کے یہاں، مثلاً اس قسم کے شعر سے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق آنے خضر	نہ تم کے چور بنے عمر جادواں کے لیے
کوہکن نقاشش یک تمثال شیریں تھا اسد	سنگ سے سر مار کر ہو لے نہ پیدا آشنا
ہنگام زبونی بہت ہے انفعال	حاصل نہ تیکھے دہر سے عبرت ہی کیوں نہو
طاعت میں مار ہے نہ ملے لانگیں کی لاگ	دورخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو
دونوں بہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا	یاں آ پڑی یہ شرم کہ نکو ار کیا کریں
گھر میں تھا کہ نرا غم اسے غارت کرتا	وہ جواک رکھتے تھے ہم حسرت بغیر سو ہے
داں وہ غرور عز و ناز یاں یہ حجاب پاس وضع	راہ میں ہم ملیں کہاں؟ بزم میں وہ بلائے کیوں

چونکہ غالب کی شاعری کا مجموعی انداز ہی طنز پر ہے اور اسی سے ان کے لہجے میں تیزی اور کرکڑ پیدا ہوئی ہے، یہ طنز یہ انداز ان کے یہاں ہر جگہ ملتا ہے۔ نواہ سن و عشق کا ذکر ہو یا خدا سے گفتگو۔ ساغر و شراب کا تذکرہ ہو، یا حیات و کائنات کے مسائل پر تبصرہ ہو۔

غرض کہ ہر جگہ طنز پر ہے کی چھاپ ہے۔ یگانہ کے یہاں ہر جگہ طنز یہ انداز تو مسلط نہیں ہے البتہ جو کرکڑ اور تیزی ہے اس میں ان کی ندرت پسند طبیعت نے امتحان کے طنز پر لہجہ (کو بھی بڑا دخل ہے۔) پاس کے یہاں یہ انداز اور کراماتین مل جل گئے ہیں۔ پھر یہ انداز غزل

میں نہ تو بڑے معلوم ہوتے ہیں اور نہ غزلیت سے عادی ہے۔ مزیت و ایماہیت جو غزل کی جان ہیں، یگانہ کے یہاں ان کی بڑی افراط ہے چونکہ ان کے سارے کلام پر ایک روحانی انداز اچھایا ہوا ہے۔ اور تنوہیت کا کہیں نام و نشان نہیں، اس لیے اس میں بانگین اور مردانہ

لیجہ داندا پید ہو جانا لازمی تھا، زندگی کے متعلق ان کا نقطہ نظر جانی ()
 تیار نہیں، مصیبت کے پہاڑوں کو کاٹنے کا عزم دو حصار رکھتے ہیں، اس سے گھبراتے نہیں، یقین محکم اور عمل بہیم پر ان کا ایمان ہے، وہ ہم کو
 زندگی کا جبر دتی ٹیغ دکھاتے ہیں، اور ہمارے اندر سچی دہیکار کا لولہ پیدا کرتے ہیں۔ مجتوں صاحب کے بقول "یاس کی شاعری ہمارے
 اندر یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ زندگی ایک جدلیاتی حقیقت ہے اور تضاد اور پیکار اس کی نمود اور بالیدگی کے لیے ضروری ہے۔" اسی لیے
 ان کے یہاں ایک نوع کا زور اور شگفتگی ہے جو غالب اور آصفیہ کے علاوہ کسی اور غزل گو شاعر کے یہاں نظر نہیں آتی۔ شیلی ()
 نے اپنی ایک نظم () میں خیال ظاہر کیا ہے کہ :-

یگانہ اس پر پورا اور پختہ اعتماد رکھتے ہیں۔ ان کا یہ انداز نظر اور غزل میں ایک اعلیٰ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یگانہ نے اور غزل کو
 جو جانی انداز، کڑک دار لہجہ، حوصلہ افزا خیالات رکھنے والا ذہن، تنہا کر سمجھتے نہ ہمارے والا عزم اور جو تو انالی اور کس بل دیا
 وہ اور غزل میں ان کا خاص () ہے۔ انھوں نے اپنی جدت پسند طبیعت سے اور غزل کی داستان
 میں ایک نیا افسانہ شامل کیا۔ اس کے دامن کو وسعت دی اور بھر شعریت اور غنائیت کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ مثلاً اس
 قسم کے بعض اشعار دیکھیے۔

مہو زندہ زندگی تلخ کا مسزنا ملا	کمال صبر ملا صبر آزما ملا
بہار زندگی ناداں بہار حبا دواں کیوں ہو	یہ دنیا ہے تو ہر کردش دہی آرام جاں کیوں ہو
امید و بیم نے مارا مجھے دور ہے پر	کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ ملا
کھینچی جو صبر دل سے اسیروں نے آہ سرد	پھر کیا تھا پاؤں موج خزاں کا اکھر گویا
لب در پا سے غرض ہے نہ تہہ دریا سے	موج دگر داب سے ہے دست دگر بیاں ہونا
پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہانگے	اسی زمین میں دریا سلے ہیں کیسا کیا
بلند ہو تو کھلے تجھ پر راز پستی کا	بڑے بڑوں کے قدم ڈنگائے ہیں کیسا کیا
پیرہن کیا گھر بھی خوش وقتی کے مائے تنگ ہے	آشیاں ہے اپنے حق میں طرفہ زانداں بہار
موج ہول سے خاک اگر آتشا نہ ہو	دنیا کے گرد باد کی نشو و نما نہ ہو
ایسا ہنوک تنگ کے کہیں بیٹھ جائے دل	دیر و حرم میں گم نگہ نار سنا نہ ہو
مہندی بندھی نہیں مرے پائے خیال میں	چاہو تو کھینچ لاؤں گزشتہ بہار کو
گرنتاراں ساحل کو دپرتے ڈر نکل جاتا	کبھی تو زلیست مشکل آزمائی مرگ آساں کو
ازل سے سخت جاں آمادہ مدا محال آئے	عذاب چند روزہ یا عذاب جا دواں آئے
عقب ہے منہ چھپانا سجدہ ناحق کے پردے میں	بلے تختہ مشق ستم لوح جہیں ہوتی
ریل راہ دل شب چراغ مٹا تنہا	بلند پست میں گزری ہے جستجو کرتے

ان اشعار میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں انداز بیان کی نوعیت دوسرے شعرا سے مختلف ہونے کے ساتھ
 مضامین کی ندرت اور نزاکت بھی موجود ہے۔ ہر بات عام سطح سے ہٹ کر کہی گئی ہے، اور ہر بات میں کوئی نہ کوئی جدت پیدا کی گئی
 ہے۔ یہ چند مثالیں ہیں در نہ ندرت بیان کے نمونے یگانہ کے یہاں بہ کثرت ملتے ہیں۔
 اس کردارے پن کے ساتھ یگانہ کے یہاں بہت سے ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن کو پڑھ کر غالب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، یہ اثر انھوں

نے براہ راست قبول نہیں کیا، بلکہ ان کی افتاد طبعیت کا نتیجہ ہے۔ اس کے اندر نہ تو اتنے بیچ دلم ہیں بقینے غالب کے بہت سے اشعار میں ملتے ہیں۔ اور نہ چینیائی انداز۔ غالب بیدل کے حکم سے نکلنے کے باوجود بیدل کی رمزیت کو نہ چھوڑ سکے، انھوں نے اسی انداز کو اپنا اور ثقیل الفاظ اور پیچیدہ ترکیبوں سے اختراز کیا۔ لیکن مضمون کا رمزیت اور طلسمی اشکال باقی رہا۔ یہ اشکال مضمون کے اچھوتے ہیں اور ایمانی اسلوب بیان کا لازمی نتیجہ تھا، یگانہ کے یہاں یہ رمزیت بالکل ان کی ذاتی چیز ہے۔ لیکن غیر شعوری طور پر (

اس میں غالب کا عکس ملتا ہے، یعنی بات کو بالکل غالب کے طریقہ پر کہا گیا ہے۔ لیکن انداز بیان یگانہ کا اپنا ہے جس پر کہیں سے تقلید کا گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ جب تک پڑھنے والا غالب کے مزاج کی اس خصوصیت سے واقف نہ ہو۔ غالب ہمیشہ بات کو درمیان سے یا سرے سے بیان کرتے ہیں، اور بہت سی ایسی کڑیاں چھوڑ دیتے ہیں جن کو خود تلاش کرنا اور بات کی بعض دوسری تفصیلات ذہن میں کر کے مکمل کرنا ہوتا ہے، اسی لیے انھوں نے اپنے اشعار کو "گنجینہ" یعنی کا طلسم کہا ہے، اس طلسم میں پہونچ کر بادی کو طلسم کھولنے کے لیے دماغ لڑانا پڑتا ہے تب جا کر اس کی روح یا نہتہ تک پہونچ سکتا ہے، بعض اوقات یہ محذوفات شعر میں بڑا لطف پیدا کرتے ہیں۔ یگانہ کے یہاں بھی ایسے بہت سے اشعار ہیں جن کو سمجھنے یا ان کی نہتہ تک پہونچنے اور ان سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہی غالب فہمی والی تھوڑی سی ریاضت درکار ہوتی ہے، ذیل کے اشعار اس دعوے کی تصدیق کرتے ہیں۔

خوشا نصیب جسے فیض عشق شہر انگینہ
پوش اڑ نہ جائیں صنعت بہر ادا دیکھو کو
خوشی سے ہو گئے بد خواہ میرے شادی مرگ
مرے کے ساتھ ہوں اندوہ دلم تو کیا کہنا
نفس سے صلح کا انجام یہی ہونا تھا
بڑھتے بڑھتے اپنا حد سے بڑھ چلا دست ہوس
برائے درد کی کوئی نگہبانی کرے کب تک
ترک اختیار آساں نہ ضبط اضطراب آساں
موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی
امید صلح کیا ہو کسی حق پسند سے
فطرت مجبور کو اپنے گناہوں میں ہے شک
موت کی یاد میں نیندا در بھی اڑ جاتی ہے
ترک لذت دنیا کیجئے تو کس دل سے
دور سے بہتے ہیں ظالم پاشکستہ جان کر
پناہ ملتی نہ اندر سیرے دنا کو کہیں
صلح جوں نے گنہ گار مجھے کھڑایا
حق میں اوردوں کے تری ذات سراپا احسان

بقدر ظرف ملاحظت سے سوانہ ملا
آئینہ رکھ کے سامنے تصویر دیکھنا
کفن پہن کے جو میں گھر سے ناگہاں نکلا
یقین نہ ہو تو کرے کوئی امتحاں اپنا
اپنی سرسائیں پر رہ رہ کے پشیاں ہونا
گھٹے گھٹے ایک دن دست دعا ہو جائے گا
حقیقت کھل نہ جائے اضطراب اندازاں ہو کر
یہی دست دعا جھلا کے اٹھ جاتا تھا دشمن پر
لے دعا کر چکے اب ترک دعا کرتے ہیں
بیچھے وہ کیا بٹے کا جو حد سے بڑھا نہ ہو
دار ہے گا کب تک توبہ کا در میرے لیے
نہیں آجائے تو کچھ موت کا ساماں ہو جائے
ذوق پارسائی کیا فیض تنگدستی ہے
خیر مقدم کی صدا دیتے ہیں منزل سے مجھے
ہوس نصیب اگر ترک آرزو کرتے
جرم ثابت جو کیا چاہو تو مشکل ہو جائے
دلے منت کہ مری مند سے تو عادل ہو جائے

یگانہ کے اسلوب کی ایک دوسری خصوصیت "تمثیلی پیرایہ بیان" یگانہ لکھنوی شعرا میں آئین کے بڑے مداح انھوں نے آئین کو خراج عقیدت کی شکل میں اپنے کئی اشعار میں پیش کیا ہے۔

کلام یاس سے دنیا میں پھر اک آگ لگی
یہ کون حضرت آتش کا ہنر باں نکلا
ہمارا رنگ سخن یاس کوئی کیا جانے
سولے آتش ہے کون ہنر باں اپنا

اس میں شک نہیں کہ دبستان بکھنؤ کے شاعروں میں جذبات نگاری کی مثالیں اورداد ذات قلب کی جھلکیاں اگر کسی شاعر کے کلام میں ملتی ہیں تو وہ صرف آتش ہیں اگرچہ ان کے یہاں بھی رعایت لفظی، ضلع جگت، صنایع بدایع اور لوازمات حسن کے معنوی بیان کی کمی نہیں۔ اور کہیں کہیں تو اس قسم کے شعر بھی ہیں۔

کوئے جاناں چمن سے بہتر ہے اس کا کتا ہرن سے بہتر ہے

لیکن اس کے باوجود ان کا کلام نسبتاً خاص و خاصاک سے پاک ہے۔ اور سچے اور حقیقی جذبات کی بوجہ میں بیشتر مقامات پر قصاں ہیں۔ لیکن جہاں تک انداز بیان کا تعلق ہے وہاں بھی آتش ایک انفرادیت رکھتے ہیں، ان کا فلندہ بانگین اور استغنا۔ آمیزہ اردو غزل میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے، ان کا تمثیلی پیرایہ بیان بھی بہت مشہور ہے۔ اردو میں تمثیلی بیان کا اگر کہیں ذکر ہو تو پہلے آتش کی طرف خیال جاتا ہے، فارسی میں صائب اور غنی اس صنعت کے استعمال کے لیے مشہور ہیں، انھیں کی ناز لختیالیوں سے متاثر ہو کر اردو کے غزل گو شعرا کے یہاں بھی اس انداز بیان کا کافی رواج ہو گیا، اس کو صنف احتجاج بہ دلیل بھی کہتے ہیں۔ اس میں شاعر پہلے ایک دعویٰ کرتا ہے پھر اس کے ثبوت میں ایک مثال پیش کرتا ہے۔ یگانہ کے یہاں کہیں کہیں تمثیلی پیرایہ بیان کا فرما ہے اور یہ آتش کے اثر کا فیضان ہے، لیکن یگانہ نے محض غرض تقلید ہی ادا نہیں کیا بلکہ اس میں ایک خاص دل کشی اور اپنا اغاہ قائم رکھتا ہے۔ جس کو پڑھ کر کہیں کہیں آتش سے زیادہ لطیف آجاتا ہے، اس قسم کی کچھ مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

چراغ زلیست بجا دل سے اک دھواں نکلا
گلکے آگ مرے گھر سے یہاں نکلا
اجل سے بڑھ کے محافظ نہیں کوئی اپنا
خدا کی شان کہ دشمن نگہباں نکلا
اب اپنی روح ہے اور سیر عالم بالا
کنویں سے یوسف گم کردہ کارواں نکلا
دل کی ہو س رہی ہے مگر دل نہیں رہا
محل نشیں تو رہ گیا، محل نہیں رہا
خلوت ناز بجا اور کجا اہل ہو س
زور کیا چل سکے فائدہ س سے پروانے کا
اپنی ہستی خدیم آغوش فنا ہو جائے گی
موج دریا آب ساحل آشنا ہو جائے گی
رفتار زندگی میں سکوں آئے کیا مجال
طوفاں ٹھہر بھی جائے تو دریا بہا کرے
نگہت گل کی ہے رفتار ہوا کی پاسبان
روح قالب سے نکلنے پہ بھی آزاد نہیں

یگانہ کے یہاں حکیمانہ خیالات اور حیات دکائیات کے بعض مسائل پر خیال آرائی تو ملتی ہے، لیکن یگانہ کے حکیمانہ افکار کوئی منظم و منضبط فلسفہ یا خیال کی وحدت اور نظریات کا تسلسل نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو سبجال نہ سکے اور جذبات کی رد میں ہر بات سے اختلاف کرتے ہوئے اتنے آگے بڑھ گئے کہ صبر و ضبط کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا، ان کے اشعار میں مشاہدات و تجربات کے بولچھور نقش ملتے ہیں۔ جن کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے زندگی کے جس پہلو پر بھی نظر ڈالی ہے اس پر کافی غور و غوض بھی کیا، رسمی و مردج خیالات ہی کو انا کرنا کافی نہیں سمجھا، انھوں نے اپنی غزل میں زندگی کے بعض اہم نکات کی ترجمانی کی ہے۔ اور ان پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ ان کی نظر بڑی دور رس اور ان کا مشاہدہ بڑا عمیق ہے۔ ان کے اس قسم کے اشعار میں ایک مفکرانہ سنجیدگی ملتی ہے۔ جو تاری کو غور و فکر پر مجبور کرتی ہے۔ اس قسم کے اشعار میں انھوں نے اپنے تجربات و محوسات اور مشاہدات کا سچوڑ پیش کیا ہے۔ جن میں حیات دکائیات کے مسائل پر تبصرہ بھی ہے اور نفسیات انسانی کے بہت سے پہلوؤں کا بیان بھی۔ یگانہ کی شاعری اپنے انتہائے عروج پر پہنچ جاتی ہے، پھر ان کا

مخصوص طرز بیان، طنز یہ لہجہ ان کے وار کو بھرپور بنا دیتا ہے۔ اور اس کو ایک خاص سطح سے نیچے نہیں آنے دیتا۔ یہی وہ سطح ہے جو یگانہ نے اپنے لیے مخصوص کر لی ہے۔ جہاں وہ تنہا نظر آتے ہیں، جن اشعار میں کسی سنجیدہ اور عمیق مسئلہ کو بیان کیا جاتا ہے، وہاں خشکی سے بے کیفی کا پیدا ہو جانا ایک لازمی امر ہے۔ یہ بات شاعر کی قدرت بیان پر منحصر ہے کہ اس میں بے کیفی پیدا ہونے پائے اور بات بھی بخوبی واضح ہو جائے۔ یگانہ نے جب بھی کسی فلسفیانہ یا حکیمانہ مضمون لیا ہے تو اس کو اپنے مخصوص انداز بیان سے انتہائی گوارا بنا کر پیش کیا ہے۔ ذیل میں اس طرح کے بعض اشعار پیش کرتا ہوں جن میں یگانہ کی فکر کے بعض اہم زوائد یہ قابل غور ہیں۔ گویا یگانہ کے یہاں فکر کا جو رجحان ملتا ہے وہ ان کے اسلوب کے لحاظ سے تو دوسروں سے مختلف ہے ہی، لیکن ان کے نظریات و افکار بھی دوسروں سے مختلف ہیں، اور اگر کہیں ایسا نہیں ہے تو طرز ادا کی ندرت نے ان میں تازگی اور نیا پن پیدا کر دیا ہے۔ کچھ مثالیں درج ذیل ہیں۔

مجھے دل کی خطا پر یاس شرمنا نہیں آتا پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

اس میں یگانہ نے صبر کے فلسفے کو اپنے مخصوص انداز میں جس طرح بیان کر دیا ہے وہ ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے۔ اہل جبر کا یہ خیال ہے کہ انسان مجبور محض ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کے حکم اور ایما سے ہوتا ہے، انسان اس کے خلاف کر ہی نہیں سکتا، اس لیے کہ وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ سرشت و تقدیر اور ماحول ہی کے سبب سے ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ انسان گناہ کرنے پر مجبور ہو گیا اس کی ساری نشوونما ماحول کی تابع ہے، اس کی تعمیر و تخریب نیکی و بدی میں ماحول و دراشت کا بھی ہاتھ ہے، جب انسان پر کار فرما اور قادر نہیں ہے، جب اس کا آزادہ بھی ایک نوع کا اضطراب ہے تو پھر اپنی خطا پر اس کے منفعیل ہونے کی کیا وجہ ہے، جوشش نے بھی اس خیال کو کئی ربا عیوں اور بعض اشعار میں پیش کیا ہے، لیکن ایسا زور و اختصار کے علاوہ جس جامعیت کے ساتھ یگانہ نے ادا کیا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے، پھر خطا پر نادم ہونے کے بجائے ایک طرح کا طنز اور نخر یہ لہجہ یگانہ کا مخصوص طرز ہے، جس نے شعر کو دوسرے شعرا کی آواز سے بالکل الگ کر دیا۔ فلسفہ جبر کے اس موضوع پر یگانہ نے اپنے کلام میں طرح طرح سے اظہار خیال کیا ہے، اور کہیں بھی دلیل و برہان کا ساتھ نہیں چھوڑا، انھوں نے اس مسئلے کو بہت سلجھا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جس سے بعض نئے گوشے بھی ابھرے ہیں، ذیل کے اشعار میں اسی قسم کے خیالات کو نہایت شگفتہ طریقہ سے بیان کیا ہے اور ہر جگہ یگانہ کے انداز بیان نے شرم میں تازگی پیدا کر دی ہے۔

سمجھ میں آگیا جب غدر فطرت مجبور	گناہ گار ازل کو نیا بہانہ ملا
بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے	وہ بد نصیب جسے نجات ناسانہ ملا
کہتے ہمارے نفل کا مختار ہے بشر	اپنی تو موت تک ہنوی اختیار میں
بندہ فطرت مجبور ہوں مختار نہیں	ہاں ندامت میں ہے شک جرم سے انکار نہیں
سہو و خطا و دعیت فطرت ہی مگر	سمجھاؤں کیا ضمیر ملامت شکار کو
الذکر سے اختیار کہ آمادہ کر لیا	نکر محال پر دل بے اختیار کو
بہانہ چاہتی تھی موت بس نہ تھا اپنا	کہ میرا بانی مہمان حید جو کرتے
خاک کا پتلا ہے رفتار نمود سے مجبور	ہر تن سنگ بنے یا ہمہ تن دل ہو جائے
صلح جوی نے گناہ گار مجھے ٹھہرایا	جرم ثابت جو کیا چاہو تو مشکل ہو جائے
یاس سر سے پاؤں تک امید ہی امید تھی	فرد جب تک ہاتھ میں تھی کاتب تقدیر کے
فطرت مجبور کو اپنے گناہوں میں ہے شک	دار ہے لگا کب تک تو بہ کا درمیر کے لیے

انوکھا گنہ گار یہ سادہ انسان
نوشتہ کو اپنا کیا جانتا ہے

لیگانہ کے یہاں غالب کی طرح "تشیکیک" کا ایک رجحان بھی ملتے ہیں جس نے انہیں مذہب و خدا اور دیر و حرم کے بارے میں بھی شبہ میں ڈال دیا، انھوں نے کئی جگہ اپنے ان شبہات کا اظہار طنز پر افاز میں کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی منزل مقصود یا مرکز حقیقی تک پہنچنا چاہتے ہیں، اگرچہ اس کا ان کو کوئی سراغ نہ مل سکا، اور وہ عمر بھر آمید و بیم اور تشکیک و تذبذب میں مبتلا رہے ذیل کے اشعار ان کے تشکیک پر روشنی ڈالتے ہیں۔

بس ایک نقطہ فرضی کا نام ہے کعبہ
امید و بیم نے مارا مجھے دیر ہے پر
شش جہت میں ہے ترے جلوہ نے فیض کی دھوم
پارا ترے کیا دوا ہے امید و بیم سے
کہیے کعبے کو سدھارے کہ صنم خلع کو
بتوں کو دیکھ کے سب نے خدا کو پہچانا
سجدہ صبح و شام کیا کرتا
زمانہ خدا کو خدا جانتا ہے

کسی کو مرکز تحقیق کا پتہ نہ ملا
کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا
کان مجرم میں مگر آنکھ گنہگار نہیں
جب نا خدا نے دل کو یقین خدا نہ ہو
دیکھا دیکھی جو کوئی آپ کا دیوانہ بنے
خدا کے گھر تو کوئی بندہ خدا نہ گیا
غائبانہ سلام کیا کرتا
یہی جانتا ہے تو کیا جانتا ہے
اس بار جلالت کے ہو گا کوئی اس پار نہیں تو کچھ بھی نہیں

ایک جھٹک ہی دکھلا دے تو دور سے جھٹکے سلام کروں
کافر و دین دار ان کے نزدیک دونوں گم کردہ راہ ہیں
دل مجھ سے پوچھتا ہے کہ تو کس طرف کو ہے
نگاہ بے نیازی نے دکھایا راستہ سیدھا
قیامت تک یہ کلمے کوس روشن ہو نہیں سکتے
غالب نے کہا ہے۔

جوش جہاد کافر و دیندار دیکھ کر
جھٹکا کوئی کب تک بناؤ شیخ و برہمن پر
عبث ہے ہر کاسب کافر و دیندار ہو جانا

قبلہ کو اہل نظر قبلہ سناتے ہیں

لیگانہ بھی کچھ اس قسم کا خیال رکھتے ہیں، اور آمید و بیم کی کشاکش میں مبتلا ہیں۔

خلاف جائز سکے شاہراہ فطرت کے
ترجیح جو میں سفر کرنے والے

ٹھٹک رہے حرم دیر کے در ہے پر
کھڑے ہیں در ہے پر دیر و حرم کے
نزل کی فکر کیوں ہو جب تو ہوا در میں ہوں

ان کی نظر میں یہ سناڑ سناڑ نہیں بلکہ محض ٹکڑے لگانے کے مصداق ہے۔ کعبہ خانہ سناڑ میں نماز کیا قبول ہو سکتی ہے خصوصاً اس وقت جبکہ اس میں "غذب و دراز" کی کوئی لہر شامل نہ ہو۔ ظاہر ہی دین داری اور ریاضت و عبادت سے معذور ان کے نزدیک محض نمائش و نمودہ ہے۔

ہو گی نماز کیا قبول کعبہ خانہ سناڑ میں
یاد گناہ کب تک شام و سحر نماز میں
نمازوں کا ہے کچھ مطلب تو پر دسی زبان کیوں ہو
نماز بے عمل سے حق مذہب رائیگاں کیوں ہو

رحمت سجدہ ہے فضول بتکدہ مجاز میں
یاد خدا کا وقت بھی آئے گا کوئی یا نہیں!
سمجھ میں کچھ نہیں آتا پڑھے جاؤں تو کیا حاصل
کہیں رسمی عبادت رواج کو بیدار کرتی ہے

کلمہ پڑھیں تو کیوں پڑھوں سب کی نظر پہ کیوں چڑھوں

دل سے خدا کا نام لے جا۔ کام کیے جا دنیا کا

مسلمان کا تصور (ان کے یہاں بہت وسیع اور بڑا آفاقی ہے، محض نذر دنا اور محض دیر دھرم ہی ان کے

یہاں منہائے کمال نہیں ہیں، لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ پڑھ لینے اور دائرہ رکھ لینے سے کوئی مسلمان نہیں ہو جاتا، دائرہ ہی تو

نکھوں کے بھی ہو چکا ہے، یا محض مسلمان کے گھر میں پیدا ہونے سے وہ مسلمان نہیں کہا جاسکتا جب تک اس میں اسلام کی نہ تمام

قافی اندر اعلیٰ خصوصیات اور ادرار یعنی اسلام کی اصل روح (موجود ہونے، محض زبان سے خدا و رسول کا نام لے کر

مشرت بہ اسلام ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا)

پڑھ کے دیکھئے اگر کوئی مسلمان ہو جائے

آگ میں ہو جسے جلنا تو وہ منہ دین جائے

جیسا کہ اوپر کہا گیا یگانہ کو خدا اور دیر دھرم کے متعلق شبہ ہے۔ دنیا ان کے خیال کے مطابق ناپائیدار ہے، ہر چیز بے ثبات

ہے، مادہ فانی ہے، آخر میں سب کو فنا کے گھاٹ اترنا ہے

خدا میں شک ہے تو ہو موت میں نہیں کوئی شک

لیکن وہ مرنے سے گھبراتے یا ڈرتے نہیں، بلکہ اس کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ اب سفر ختم ہوا

موت آئی آنے دیجیئے، پر دانہ کیجیئے

منزل ہے ختم سجدہ شکرانہ کیجیئے

مگر فردا پر ان کا بالکل یقین نہیں، فردا ان کے نزدیک ناقابل اعتبار حقیقت ہے اس کی دجوان کی نظر میں یہ ہے کہ ان

انسان کی مثبت عملی طاقتیں فردا کے تکیہ یا آسے میں کمزور اور دھیلی ہو جاتی ہیں۔ اور اس میں وہ قوت عمل اور جوش و دلولہ

باقی نہیں رہتا جو آج اس میں موجود ہے دوسرے چونکہ ان کے یہاں انان مجبور ہے اس لیے معلوم نہیں کیا صورت پیش آئے

اور وہ اپنے عمل پر قادر نہ رہ سکے۔ یا کل وہ بات اس کے قبضہ قدرت سے باہر ہو جائے، اسی لیے انہوں نے کئی جگہ اپنے مخصوص

انداز میں فردا کا مذاق اڑایا ہے

فردا کو دور ہی سے ہمارا سلام ہے

اسی فریب نے مارا کہ کل ہے کتنی ددرا

اک معنی بے لفظ ہے اندیشہ فردا

عجب کیا وعدہ فردا پس فردا پہ ٹل جائے

لذت مژدہ فردا میں جو ہیں ڈوبے ہوئے

دکھائی آج ہی آنکھوں نے صورت فردا

خیال خام ہے یا معنی مہم کیا جا نہیں

دل ناخرم فردا خدا کی مار ہو تجھ پر

کون جلنے وعدہ فردا فنا ہو جائے گا

لذت زندگی مبارک باد

کبھی حقیقت فردا سنو تو کان کھلیں

سلامت آپ کا یہ حسن لازدال مگر

دل اپنا شام ہی سے چراغ سحر ہوا

اس آج کل میں عبث دن گزرائے ہیں کیا گیا

جیسے خط شمت کہ پڑھا بھی نہیں جاتا

کوئی شام ادا آجائے نہ شام بے سحر ہو کر

طعنہ غفلت امروز سنا کرتے ہیں

خزاں کی سیر بھی ہنگامہ بہار میں ہے

سمجھ میں راز فردا کیوں نصیب دشمنان آئے

ابھی سے نشہ حسن عمل میں چور ہو جانا

آج سے کل تک خدا معلوم کیا ہو جائے گا

کل کی کیا فکر، ہرچہ بادا باد

نڈائے دل ہے کوئی ددرا کی پکار نہیں

ہم آج ہی کے ہیں کل کے امیدوار نہیں

جو دم ہے عنایت ہے، کیا جانے کل کیا ہو اک دُور کی نسبت ہے امر دہ کو فردا سے
 یگانہ کے یہاں ایک خود پرستی کا رجحان بھی ملتا ہے جو خودی یا خودداری کی بگڑی ہوئی شکل ہے ان سب کو بگاڑنے میں ان
 سب حالات کا ہاتھ ہے جو غالباً شکن لکھنے کا باعث ہوئے اور جس کے بعد یگانہ خودی یا خودداری سے خود پرستی پر اتر آئے خود
 کہتے ہیں ۛ

خود پرستی کیجیے یا حق پرستی کیجئے ۱۰ کس دن کے لیے ناحق پرستی کیجیے

ناحق پرستی کا اشارہ غالب پرستی کی طرف ہے جو مکتوں کے اساتذہ پر ایک طنز ہے، ایک دوسری جگہ قدس دہشتا
 سے کہتے ہیں ۛ خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا خدا بتے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا
 یہ شعر ان کے نظریہ اور خیال کا بڑا اچھا ترجمان ہے کہ کس طرح خودی کے نشہ نے ان کو آپ سے باہر کر دیا، اور وہ خدا بھی نہ بن
 سکے، لیکن اس سے انکار نہیں کہ خود پرستی کا یہ رجحان بھی اردو غزل بلکہ اردو شاعری کے لیے نئی چیز ہے، ان کی حق پرستی خود پرستی
 ہے۔ اسی لیے وہ خود کو سجدہ کرنے کے لیے تیار ہیں، جس سے نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ وہ انسان کی عظمت کے قابل ہیں، انسان
 کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت سمجھتے ہیں، ان کے خیال کے مطابق یہی حق پرستی ہے کہ خود کو پہچان لیا جائے، جس نے خود کو سمجھ لیا اس
 نے حق کو سمجھ لیا، لیکن یہ تصوف کے اس نظریہ کہ انسان اپنے تئیں اس خدا تک پہنچ سکتا ہے سے بالکل مختلف ہے، یگانہ کو خدا اور
 دیر و حرم کے متعلق شبہ ہے لیکن انسان جیسی کھلی ہوئی حقیقت پر ان کا ایمان ہے اور اس کی عظمت کے وہ قائل ہیں، انسان ان
 کے نزدیک ایک زبردست قوت ہے جس کو سجدہ تک لازم ہے۔ اگر یگانہ اپنے آپ کو سمجھا لے جائے اور خود پرستی یا ہم جو
 من دیگرے نیست کا شکار نہ ہو جائے اور اپنی فکر کو منظم اور منضبط صورت میں پیش کرنے تو ان کا کارنامہ کہیں زیادہ وسیع اور ایک
 خاص نقطہ خیال کا حامل ہوتا۔ ان کی خود پرستی یا حق پرستی کی نوعیت کی جھلک ذیل کے اشعار میں دیکھی جاسکتی ہے ۛ

آئینہ ہے وہ زیارت گاہ جسکے سامنے خود پرستوں کے لیے سجدہ روا ہو جائے گا
 خود پرستانِ ازل دارِ ندایا نے دگر حق پرستی می کنند آما بہ عنوانِ دگر
 نہ ہے معراج انسانی کہ بندہ ہوں اپنا ہوں چڑھایا خود پرستی نے نگاہِ دوست و دشمن پر
 بندہ خود شناس ہے اپنے ہی پیر میں ہر مست بے خودی کو دخل کیا پیش گاہِ ایاذ میں
 کیا بتاؤں کیا ہوں میں قدرتِ خدا میں میری خود پرستی بھی عین حق پرستی ہے
 دلیلِ راہِ دل شب چراغِ تھانہا بلند و پست میں گزری ہے جستجو کرتے
 مزہ تو جب ہے یگانہ کہ یہ دلِ خود میں خودی کے نشہ میں بے گانہ خمار رہے

اب مختلف النوع مضامین کے مزید اشعار ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔ جن میں یگانہ نے حیات و کائنات کے بعض مسائل
 پر اظہار خیال کیا ہے، ان اشعار کو دیکھنے کے بعد یگانہ کی قدرت و اندازِ قدرت بیان کا کلمہ پڑھا جاسکتا ہے ۛ

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے وہ بد نصیب جسے سخت نارسا نہ ملا
 اصلاح کی مجال نہیں ہے تو کیا غرور بے ربطی نوشتہ تقدیر دیکھنا
 ازل سے اپنا سفینہ رواں ہے دھڑے پر ہوا ہنوز نہ گرداب کا نہ ساحل کا
 نگاہِ دل کو اب انجام کار کا کھٹکا۔! بہر گھل سے بھی اک پہلوئے خزاں نکلا
 قصہ کتابِ عمر کا کیا خفت ہو رخ داستانِ غم کا ادھر سے ادھر ہوا
 دل مراد کھتا ہے خاند گل کو باہم دہ کر دیدنی نا دیدنی دوزوں کو توام دیکھ کر

زمانے بھر کا منہ بکتے ہیں کیوں اپنی طرف دیکھیں
پیام غفلت جا دیدہ ہے جلوہ حقیقت کا
موج ہوا سے خاک اگر آشنا نہ ہو
حیرت نے شش جہت میں نظر بند کر دیا
خدا پرست بھی بندے ہیں صن فطرت کے
ہمیشہ منظر انقلاب رہتے ہیں
بن و پست برابر ہیں اپنی نظردن میں
سعادت ابدی ہے مشیت ازلی
شاہدے کو اک آئینہ جمال دیا
عالم اسباب سے کیا فیض ناکامی لا
کھل گئے عیب و ہنسب کا تب تقدیر کے
ہاں وسعت زنجیر تک آزاد بھی ہوں میں
ہر شام ہوئی صبح کو اک خواب فراموش
ہوش و خرد حقیقت روشن کہیں جسے
صبح و شام زندگی خواب پریشاں ہی سہی
غنجہ کے دل میں کچھ نہ کھتا اک آہ کے سوا

بسر کرنا ہے جن کو رنگ دلوے رائیگاں ہو کر
ساجائے نہ آنکھوں میں کہیں خواب گراں ہو کر
دنیا نے گردبار کی نشوونما ہو
نا محرم طلسم خزاں نہ ہمارا کو
سمجھ میں آئے نہ راز اس طلسم حیرت کے
مزانج داں ہیں جو ہنگامہ زار فطرت کے
خیال خام ہے یا دلوے ہیں سیرت کے
ہوس فصول بھر سے ہے حسن خدمت کے
کمال عشق نے جو ہر دکھا دیے دل کے
راہ پر لا کر مجھے بھٹکا دیا تقدیر نے
رنگ ہیں آمادہ پرواز ہر تصویر کے
ہستی مری تجوید امداد رہے گی
دنیا ہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی
ہے اک چمک سی پردہ مدامتال میں
کچھ حقیقت کا بھی جلوہ باطل میں ہے
پھر کیا شگفتی کی تمنا کرے کوئی

سطور بالا میں جو کچھ کہا گیا ہے اور جو مثالیں پیش کی گئی ہیں ان سے اندازہ ہوا ہوگا کہ یگانہ کا اصل میدان یا موضوع سخن فطرت انسانی کی کیفیات کا بیان ہے، اس کے علاوہ انھوں نے عالم اور نظام عالم پر بھی بہت کچھ غور کیا۔ حیات کے متنوع اور پیچیدہ مسائل پر فکر و نظر کی گہرائی ان کے ہاں ملتی ہے، لیکن حسن و عشق کی کیفیات اور حدیث نبوی و رسالہ کا بیان ان کا اصل موضوع نہیں ہے، انھوں نے یہ بیان زیادہ طبع آزمائی کی ہے، ان کے عشقیہ اشعار میں اگر ان کا لہجہ اور انداز شامل نہ ہوتا تو وہ اردو کے ہزاروں فرسودہ درسی اشعار کی صف میں آجاتے۔ یگانہ نے اپنے جن اشعار میں حسن و عشق اور کیفیات محبت کی باتیں کی ہیں ان کو ردایتی تو نہیں کہہ سکتے البتہ مصنوعی فرد کہہ سکتے ہیں، اس قسم کے اشعار ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محض ان کے دماغ کی پیداوار ہیں اور ان میں وہ کیفیت نہیں ملتی جس سے متعلق کہا گیا ہے کہ 'از دل خیزد و بد دل مریزد'۔ اس کی ایک وجہ ان کی غزلوں کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ عشق و محبت کے کوچے سے نا آشنائے محض ہیں، اس کے نشیب و فراز، اس سلا میں پیش آنے والی کیفیات و دار و دات اور عشق کی تپش و خلش اور سوز و گداز کا ان کو علم نہیں، ان کے عشقیہ اشعار میں نہ دھڑکتا ہوا دل ملتا ہے اور نہ مدتی ہوئی آنکھ۔ ان سب باتوں کے متعلق ان کا علم سماعی اور تخیلی معلوم ہوتا ہے اس لیے اس میں وہ تپش اور سوز نہیں جتنا عقائد عاشقہ شاعرین کے یہاں ملتا ہے۔ دوسرے انکی اس ذہنی پیداوار میں بھی ان کا کڑا اندر تن و تیز لہجہ، طرز ادا اور اکثر اس میں سوز و گداز، سپردگی، دالہانہ ربودگی پیدا ہونے نہیں دیتی جس سے ان کی بات دل کو لگ سکتے۔ اور نقل میں اصل کا لطف آئے۔ وہ خود اپنے آپ کو تائب و سمجھتے ہیں کہ کبھی سپردگی کے لیے تیار نہیں ہو سکتے، سرور صاحب کے بقول 'پر حرم حسن میں بھی اپنے آپ کو کھلا نہیں سکتے' ان کے یہاں عشقیہ اشعار میں غزل کی مخصوص اور مروج غنائیت کے بجائے ایک کراہ انداز ہے۔ جس میں شمریت کا فقدان نہیں لیکن چونکہ ہمارے کان اس سے آشنا نہیں ہیں اس لیے ہمیں اس میں اکھڑا اکھڑا پن اور بے کیفی محسوس ہوتی ہے۔ ریاض خیر آبادی

کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے کبھی شراب نہیں پی لیکن شراب اور اس کی کیفیات اندہ جزیات کا بیان ان سے بہتر اور کار
 آگاہ طور پر اردو شاعری میں کسی کے یہاں نہیں ملتا، وہ نہ ہی انداز بیان اور طبیعت کا جھکاؤ ہے۔ اردو میں بہت سے ایسے
 غزل گو شاعر ہیں جو عشق و محبت کے کوچے سے نابلدہ رہے ہیں لیکن ان کے تغزل میں جو کیفیت، سپردگی اور سوز و ساز ملتا ہے اس
 کو پڑھ کر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ذل گداختہ سے نکلے ہوئے تنہا ہیں، لیکن جیسا کہ سطر بالا میں کہا گیا یگانہ کے تغزل میں نہ کوئی لطف
 ہے اور نہ جدت اور نیا پن، نہ دالہانہ انداز اور نہ نگین، بیانی ہی کہ جس سے بات اثر کن بن کر دامن دل کو اپنی طرف کھینچ لے۔ یہ چیز ہے
 تو یہی کہ کہیں کہیں اس کا کردار اپن یہاں بھی چھایا ہوا ہے ذیل کے اشارے ان کے متغزلانہ رنگ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:-

آنکھ جھپکی تھی تصور بندھ چکا تھا یا لہر کا
 جانِ ایساں ہے ابھی وہ آنکھ شرمائی ہوئی
 چمنوں سے ملتا ہے کچھ سراغِ باطن کا
 دور سے ان کو آج دیکھ لیا
 چپ لگی مجھ کو گستاخ عشق ثابت ہو گیا
 شب تاریک نے پہلو دیا یا رذر روشن کا
 زنجیر پھر ہادی نسیم بہار نے
 داہ کس ناز سے آتا ہے ترا در شباب
 دیکھ کر آئینے میں چاک گریباں کی بہار
 خنجر نہیں ملتا ہے تو ہم کو نہیں پاتے
 سایہ دیوار سے لپٹے پڑے ہو خاک پر
 پیدا نہ ہونہ میں سے نیا آسماں کوئی
 دلہری دار فتگی جاتی رہی سب بھوک پیاس
 دیندار دہت پرست اترتے ہیں ایک گھاٹ
 جلوہ گر رہنے لگا چشم تصور میں کوئی
 یہ کس کے سر رہے گا خون ناحق بے گناہوں کا
 کٹھینوں سے جو ہم کو بزم میں تم دیکھ لیتے ہو
 اسیروں کی یہ خاموشی کسی دن گل کھلائے گی
 دیوانہ دار دہڑکے کوئی پیٹ نہ جائے
 ہے جان کے ساتھ ادراک ایمان کا ڈر بھی
 وہ ہم سے نہیں ملتے ہم ان سے نہیں ملتے
 اندری بیتابی دل وصل کی شب کو
 اندر رہے توڑ پیچی لگا ہوں کے تیر کا
 دیولنے بن کے ان کے گلے سے لپٹ بھی جاؤ
 لڑکھڑا کر ذرا کا ندھے پہ سہارا جو کیا!

چونکتے ہی حسرت دیدار کا دفتر کھلا
 کیفیت میں ڈوب کر کیا جانے کیا ہو جائے گی
 چال سے تو کافر سادگی برستی ہے
 دل کو تسکیں ہوئی مگر نہ ہوئی
 رنگ چہرے کا ازار از دل مضطر کھلا
 نہ ہے قسمت مری بالیں پہ تیرا جلوہ گر ہونا
 پھر باہر آپ سے ترا دیوانہ ہو گیا
 جس طرح مدد چلے بزم میں پیانے کا
 اور بگڑا ہے مزاج آپ کے دیوانے کا
 جب ہم کو وہ پاتے ہیں تو خنجر نہیں ملتا
 اٹھ چلو در نہ وہ کافر بدگماں ہو جائے گا
 دل کا نپتا ہے آپ کی رفتار دیکھ کر
 چشم بلیل سے گلوں کو غرقِ شبنم دیکھ کر
 کیا معجزہ ہے جس خنیش ابروئے یار میں
 حضرت دل بے سبب راتوں کی بیداری نہیں
 دنا داروں کی ضد سے آپ قتل عام کرتے ہیں
 کھٹک جاتے ہیں کانٹے کی طرح ہم چشم دشمن میں
 قفس سے چھوٹ کر سر پر اٹھائیں گے گلستاں کو
 آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھنا کیجئے
 وہ شوخ کہیں دیکھ نہ لے مڑ کے ادھر بھی
 اکہ نامزد دل آدیزاد حسد بھی ہے ادھر بھی
 کچھ کشمکش شوق بھی کچھ صبح کا ڈر بھی
 ان بھی نہ کرنے پائے تھے اور دیکھے پار تھا
 کام اپنا کر لو یاس بہانے بہانے میں
 ہاتھ کیڑائے ہیں ظالم نے مرے شانوں سے

نشہ کام آنکھوں ہی آنکھوں سے پیے جاتے ہیں

نشہ حسن کی یہ لہر الہی تو بہ

پردہ ناز خود اٹھے دست دعا اٹھائے کیوں

دید کی التجا کردوں؟ نشہ ہی کیوں نہ جان ددوں!

زیادہ اشعار اس لیے پیش کیے گئے کہ ان کے رنگ و انداز کا پوری طرح اندازہ ہو سکے۔ میر کا رائے میں ان اشعار میں صرف

یقین ایسے ہیں جو کسی ادسط درجے کے انتخاب میں شامل کیے جاسکتے ہیں یعنی یہ اشعار سہ

جان ایماں ہے ابھی وہ آنکھ شرمائی ہوئی

چتوڑوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا

کیفیت میں ڈوب کر کیا جانے کیا ہو جلے گی

چال سے تو کافر پر سادگی برستی ہے

دور سے آج ان کو دیکھ لیا

یگانہ اردو غزل میں اپنے اشعار کی دہ سے زندہ نہیں رہیں گے نہ اب اس حیثیت سے ان کو کوئی جانتا ہے، ان کا اصل کثر می بیوشن جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے ان کا شیکھا اور کرار انداز بیان ہے جو بات کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔ اور اس میں آواز اور موسیقی کے لحاظ سے ایک نیا زبرد ہم اور ایک نیا آہنگ پیدا کر دیتا ہے، جو اردو غزل کے سرمایے میں اسٹائل کا واحد نمونہ ہے۔ دوسرے ایسے اشعار جن میں حیات و کائنات کے مختلف النوع مسائل و مراحل پر تبصرہ ہے، جن میں انھوں نے انسان اور کائنات کے بڑے بڑے نفسیاتی حقائق و مشاہدات شاعرانہ لباس میں پیش کیے ہیں، اور بعضوں میں اسرار چھپانے کی خواہش نہ ہی نقطہ نظر سے کفر کی حد تک پہنچ گئی ہے، بس ان کی غزلوں کی بلکہ ان کی شاعری کی یہی وہ خصوصیات ہیں جو ان کو اپنے مباحرین کی صف میں نمایاں کرتی ہیں۔ اور دینے نہیں دیتیں۔ اور دراصل یہی ادب کو ان کا عطیہ ہے۔ یا پھر اس کی زباں دانی، محاوروں، اور دہرہ کا استعمال ان کی بعض تراکیب، عروضی نکتے، اور بلاغت، یعنی ان کی فن کاری میں لطف آتا ہے۔ یگانہ کے یہاں عروض کی وہ بازیگاری ملتی ہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے قاری کو ان پر بھی غور کرنا اور ان سے لطف اٹھانا پڑتا ہے مثلاً اس طرح کے اشعار سہ

سوائے آتش ہے کون ہمزباں اپنا

ہمارا رنگ سخن یاس کوئی کیا جانے

ابل پڑا ہے پھر رنگ نقش باطل کا

ہوا پھر ہی افسردہ دلوں کی رت بدلی

تنگ مزاجوں سے ٹھہرا معاملہ دل کا

خدا بچلے کر نازک ہے ان میں ایک سے ایک

الندے حسن پیر ہن تار تار کا

دیکھو تو اپنے حشیوں کی جامہ زیبیاں

شادی مرگ ہو گئے عید کے دن نماز میں

سجدہ اولیں میں یاس پاگے داد بندگی

اگر کوئی شخص عروض سے واقف نہیں ہے تو ان کو صحیح پڑھنے میں سے دقت ہوگی مثلاً پہلے شعر کے دوسرے مصرع میں لفظ آتش کے بعد زبان رکتی ہے اور البیابا لگتا ہے کہ یہاں کوئی افسانہ ہو نا چاہیے، حالانکہ مصرع موزوں ہے، دوسرے رکن پر تسکین اسط کا نہ حالت واقع ہوا ہے اس دہرے اس مصرع کی تقطیع 'مفاعیلن فاعلن فاعلن' کے بدلے 'مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن' پر ہوگی۔ اور میں نے یگانہ کے حکیمانہ انکار ان کے تغزل اور خاص طور سے ان کے منفرد انداز بیان اور لب و لہجہ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے لیکن یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ یگانہ کے یہاں مضامین میں خاصا تنوع موجود ہے، انھوں نے حسرت کی طرح نہ تو اپنے کو حسن و عشق کے کوہ میں دلف کر دیا، نہ فانی کی طرح فلسفہ عم کو اپنا ڈھنسا کھجوا بنا دیا، نہ اصغر کی طرح تصوف کے ظلم میں گرفتار ہوئے، انھوں نے زندگی کا مختلف رخوں سے مطالعہ کیا ہے۔ حیات کے بہت سے نکات کو بیان کیا اور ان پر تبصرہ کیا ہے۔ غزل کو 'نڈیانہ' متشام، 'دھیجے' اور سریلے لہجے کے سبیلے ایک کوک، نار اور مردانہ لہجہ عطا کیا ہے، جس میں بڑی ہم آہنگی اور بڑا کس بل ہے، یگانہ کے اس قسم کے اشعار قاری کے ذہن پر ایک بہ تاثیر بھی چھوڑتے ہیں کہ زندگی کے نقائص و محاسن، خیموں اور خامیوں اور نور و ظلمت پر بھی اس کی نظر پڑنے لگتی ہے۔ یگانہ کے اشعار پڑھ کر قاری کو زندگی کے بامے میں ایک بعیرت حاصل ہوتی ہے، ان کے اشعار کو اگر تنقید حیات

(کہا جلے تو بے جان ہو گا، انھوں نے اپنے کو کسی خاص موضوع کا پابند نہیں کیا، بلکہ بیشتر موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ دجود باری تھائے، دیرِ حرم، نوزِ دنار، کفر و ایساں، مرگ و زلیبت، روح و جسم، مادہ، جبر و قدر، بے ثباتی، دنیا، فنا، بقا، رنج و خوشی، آغاز و انجام، نیکی و بدی، انسان کی عظمت، امید و بیم، صبح و شام، یہ سب موضوعات ان کی غزلوں میں جاری و ساری ہیں، اور ان سب پر انھوں نے حکیمانہ انداز میں انہماک خیال کیا ہے۔ غالب کی عظمت کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ انھوں نے زندگی کے ہر پہلو پر اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے جس سے ان کی شاعری میں بڑا تنوع آگیا ہے اس کے برخلاف ذوق اور مومن کے یہاں یہ خصوصیت نہیں ملتی، ذوق اور مومن کیا اقبال کے مقابلے میں بھی غالب کی عظمت و برتری کا بڑا سبب ان کا تنوع ہی ہے۔ درنہ آج اقبال غالب کے کہیں بڑے شاعر ہوتے۔ کچھ اسی کی طرح کی صورت یگانہ کے یہاں بھی ملتی ہے، زندگی کی شاید ہی کوئی اہم لہر ہو جو یگانہ کے ذہن سے ہو کر نہ گزری ہو، گو یا یگانہ نے غزل کو زندگی اور زندگی کو غزل بنا دیا۔ وہ اپنے دور کا بڑا درد دار انقلابی شاعر تھا۔ جس نے غزل کی دنیا میں انقلاب پیدا کیا اور ایک نئے مدرسہ فکر کی طرح ڈال دی۔ گو خود پرستی اور بعض دیگر حرکات (مثلاً غالب شکنی وغیرہ) کے باعث ان کو نظر انداز کرنے کا سلسلہ قائم ہوا۔ لیکن نقاد کا فرض ان سب باتوں سے بچنا ہے، نقاد تو فن کا پارک ہے، اس کو تو فن پارے کے حق و باطل سے بحث ہے، اس کو کسی کے کردار سے بحث نہیں، وہ مولوی یا مفتی نہیں ہے، نہ اس کو اس کی ضرورت ہے، اس کو ہر حال میں غیر جانبدار ہونا ہے) رہنے کی ضرورت ہے، اگر ایسا نہ ہو تو وہ فن کا درد اور فن پارے کے ساتھ انصاف نہ کر سکے گا۔ یگانہ کا مطالعہ بھی ہمیں ان کی اور ان کے کردار کی ان سب باتوں سے خالی الذہن ہو کر کرنا چاہیے۔ جی ان کے شاعرانہ مرتبہ کا صحیح یقین ہو سکتا ہے۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے ایک بات یہ عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ بعض لوگوں نے یگانہ پر اعتراض کیا تھا کہ ان کے یہاں ایک نیا آہنگ اور مردانہ لب و لہجہ تو ملتا ہے لیکن یہ موسیقیت آگیاں اور ترنم و ریزانہ نہ نہیں ملتا جو غزل کی مخصوص کیفیت میں شمار ہوتا ہے ان کے اشعار نشر کی سی کھٹک اور میٹھے در دیے بجائے تلوار کا گھاؤ عطا کرتے ہیں، اس کی وجہ ان کے یہاں شعریت و تاثیر کی کمی میں تلاش کی جاسکتی ہے۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں، یگانہ کے یہاں ایسے اشعار بھی کہیں مل جاتے ہیں جن میں شعریت و غنیت مفقود ہے اور نشر کا انداز اور سپاٹ پن ہی پیدا ہو گیا ہے، اور اخیر زمانے میں تو یگانہ نے محض ضرب الانحال اور محاورہ بندی یا مرد مزہ کے استعمال ہی کو، شیوہ اہل نظر سمجھ لیا تھا، جس کے باعث ان کا کلام لطافت و کیفیت سے محروم ہو کر زبان دانی کے مظاہرہ کا میدان بن گیا، اور شعریت و تاثیر رخصت ہو گئی، مثلاً اس قسم کے اشعار

دل کا بنا بنا یا گھر دندا بگر گیا	پالا امید و بیم سے ناگاہ پڑ گیا
رازِ قدرت بکھانے والا	پہلے اپنی تو ذات پہچانے
فطرت کا اقتضائے بندے کی کیا خطا ہے	صورت ہی ایسی پیاری بکھو تو رال ٹپکے
خود سر چڑھائے خود مارا اتارے	قربان قیری اٹھیلیوں کے
بھلتے نہ دیکھے سارے کے سارے	اُن ری مشیت پھولے تو لاکھوں
کوئی کھلتا ہے جاننے والا	پیٹ کے ٹکے لاکھ بڑ مارے
بے دھڑک دلیں ٹھانے والا	ماہ دپتے لیٹ پڑے نہ کہیں
نچے رہ رہ کے تانے والا	میں سمجھ لوں گا و دست سے تو کون
میں کہاں ہمارے ماننے والا	چت بھی اپنی ہے پٹا بھی اپنی ہے
چھانٹا کیا ہے چھاننے والا	خاک میں مل کے پاک ہو جاتا

انگور کھٹے ہوں خواہ میٹھے
منہ سے نہ بولوسر سے تو کھیلو
ایسے کے پاؤں چوہے یا پیار کیجیے
منہ زوریوں کا حوصلہ سرکار حسن سے
کدھر چلا ہے ادھر ایک رات بستا جا
جفلے پنچہ خوشخوار سے جو بس نہ چلے
ہائے یہ ہسکی ہسکی باتیں کیوں
لگی ہو چاٹ جنہیں تیری بد زبانی کی !!
کہیں پتھر بھی ہو سکتا ہے پانی
بجھائے کون تو جس کو جلانے

تو کہاں اور کہاں وہ جلوہ پاک
گھل گئے جیسے موم کی مسدیم
فلسفی کو خبر نہیں اپنی
گوشہ گیر ہی ہے اک انوکھا سانگ
حسن پر فرعون کی بھینتی کہی
خدا کی ماہ وہ ایام شور و شر گذرے
آگ بجھ جائے اگر پیاس بجھائے نہ بجھے
اپنی ڈنکی اپنا آگ اپنی دودھ ہے اپنی بھاگ
کام کیا فلسفی کا زندگی میں

بے دسترس کی طعنہ زنی کیا
ہے ماجرے ناگفتنی کیا

قدیموں پر میں جھکا تو وہ دو نا اکر گیا
آخر پڑی وہ مار کے چر سا ادھر گیا
گر جتنے دالے گر جتا ہے کیا برستا جا
تو بن کے نشک نوالہ گلے میں کھپتا جا
کیا کوئی بھنگ چڑھ گئی سرکار
ادب سے بیٹھیں گے نیچے وہ منچلے کیوں کر
دعاؤں کی رسائی ہو چکی بس
پتنگوں کی چڑھائی ہو چکی بس
دل بے باک تیری آنکھ میں خاک
کیوں بڑھایا تھا دل جلیوں سے تباہ
آنکھ کے آگے ناک سوچے خاک

(پوری غزل)

(پوری غزل)

وہ جن سوار تھا سر پر کہ سر سے در گذرے (پوری غزل)
پیاس ہے یا کوئی ہو کا کہ پیسے جاتے ہیں
کہنے میں بات آتی ہے سردار نہیں تو کچھ بھی نہیں
کیوں ہو بیٹھے بھائے رنگ میں بھنگ

یہ ان کے دوسرے اور آخر دور کے اشعار ہیں جب کہ ضرب المثال اور محاورہ بندی کو انھوں نے اپنا وسیع نظر بنایا تھا چنانچہ بعض پوری پوری غزلوں میں یہی کرشمہ کاربایا نظر آتی ہیں اب وہ اشعار دیکھیے جن میں یہ کرشمے تو نہیں لیکن پھر بھی کیفیت ادب تاثیر سے معرئی ہیں۔ ان کو منظوم کلام کہا جاسکتا ہے اور مرثیہ تبرکاً پڑھا جاسکتا ہے۔

سب دیکھتے ہی دیکھتے دیرانہ ہو گیا
کوئی آسا ہے نا ہموار کا ہموار ہو جانا
ذرا اے بندگانِ ناخدا ہشیار ہو جانا
کوچہ یار میں کیوں ڈھیر ہو بے گانے کا

دیر درجہ بھی ڈھیٹے گئے جب دل نہیں رہا
بہت میں نے ٹٹولا جاوہ شیخ و برہمن کو
کوئی طوفان آیا یا ہمارے کان بچتے ہیں
لاش کبخت کی کیجے میں کوئی پھککا دے

خون ہلکا ہے بہت آپ کے دیوانے کا
جب گڑھے میں گور کے انسان داخل ہو گیا
کچھ نہ سوچھا خاک کے پستلوں کا عالم دیکھ کر
مفت دن گئے کو ہم پکڑے گئے بے گار میں

کیا عجب ہے جو حسنیوں کی نظر لگ جائے
اس طلسماتِ عنامر کی حقیقت کھل گئی
آنکھ دالے راہ میں حیرت کے پتلے بن گئے
مر گھٹنے کے لیے بے دقت کٹنے کے لیے

صدے دیے تو صبر کی دولت بھی دے گا وہ
دیواریں بچاند بچاند کے دیوانے چل لے
بہت دست جنوں نے گدگدایا چب تو کیا کرتے
آپ کے بیمار غم نے سختیاں جھیلیں بہت
گلے پر پھری کیوں نہیں پھر دیتے
گریباں میں منہ ڈال کر خود تو دیکھیں!
اپنی ہستی میں بھی کچھ شک آ پڑا
زندہ رکھا ہے سسکنے کے لیے
بہلے گیا گھر بھی ابر کرم
وہ جوانی کی موج وہ منجھو ہمار
دور سے دیکھ لو حسنین کو
خط بند ہے ہر خواہ شغف کفر
کس چیز کی کمی ہے سخی کے خزانے میں
خاک اڑ رہی ہے چاروں طرف غاتے میں
اتاریں بیڑیاں اور پہننے دہرے طوق گردن میں
شب بکھرا در ایک دھادا آخری منزل کا ہے۔
اسیروں کو بے بال دپر کرنے والے
برائی پر میری نظر کرنے والے
علم کا سودا بڑا مہنگا پڑا
داہ اچھے دوست سے پالا پڑا
جو بویا تو کیا اور نہ بویا تو کیا
خیریت بخیر۔ بیڑا پار
نہ بنانا کبھی گلے کا پار
جس سے پایا اسی کے سرے مار

لیکن مجموعی طور پر ان کے کلام کا یہ رنگ نہیں ہے۔ ان کے یہاں شعریت، موسیقیت اور تاثیر کی بڑی افراط ہے، لیکن اعتراض۔ حسرت جگر۔ کافی یا بعض دوسرے ممتاز غزل گو شاعر کے کلام کی شعریت، موسیقیت کے معیار سے یگانہ کی شاعری کو جانچا جائے تو یقیناً فرق محسوس ہوگا۔ چونکہ انھوں نے اردو غزل کی مردہ روایات اور مخصوص نفا سے انحراف کیا ہے۔ اس لیے ہمیں ان کے یہاں ایک اجنبیت سی محسوس ہوتی ہے۔ اسی اجنبیت جہاں ہر عام آدمی زیادہ دیر تک ٹھہر نہیں سکتا۔ نہ بخوشی یگانہ کے ساتھ زیادہ دیر تک جاسکتا ہے۔ لیکن اس اجنبیت کے پردے میں ایک نئی آواز کی رززشیں موجود ہیں جن سے اردو غزل کی نئی نسل کو بہت کچھ امیدیں وابستہ ہیں، محبتوں صاحب تے میچ کہلے کہ یاس ان لوگوں میں سے ہیں جن کے کلام کی رہنمائی میں غزل کی ایک بالکل نئی نسل پیدا ہو سکتی ہے۔ جو اس قابل ہو کہ زندگی کے نئے میلانات اور نئے مطالبات سے عہدہ برآ ہو سکے۔

اسی سلسلے میں دوسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ پہلے سے کوئی معیار یا اصول بنالینا اور ان پر شاعر کو جانچنے کی کوشش کرنا حد درجے غلط ہے۔ ہر شاعر کے کلام کی نفا، اس کے جذبات، محسوسات، اس کا ماحول اور اس کی خصوصیات دوسروں سے مختلف ہوتی ہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک شاعر کی بعض خصوصیات کی کسوٹی پر ہر شاعر کو پرکھا جائے اور پھر اس کی قدر و قیمت کا فیصلہ کر دیا جائے۔ اگر ہم غالب کے معیار سے داغ کو پرکھنے بیٹھیں تو جو صورت ہوگی وہ ظاہر ہے، اسی طرح اگر داغ کی خصوصیات شاعری کے آئینہ میں غالب کو پرکھا جائے تو حقیقت معلوم۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ اس شاعر کے یہاں وہ کون سی خصوصیات اور کون سی اعلیٰ قدریں ملتی ہیں جو اس کو بڑا بنا سکتی ہیں۔ یا عظمت کے قریب لاسکتی ہیں۔ اور وہ دور تک ہمارا ساتھ دے سکتا ہے۔

یگانہ کا بات لاکھنے کا انداز یعنی مشبوہ گفتار چونکہ دوسرے غزل گو شعرا سے مختلف ہے اس لیے لوگوں نے یہ رائے قائم کر لی کہ ان کے یہاں شعریت و موسیقیت کی کمی ہے۔ اور ان کی بات تاثیر سے محروم ہے، حالانکہ ان کی آواز کا جادو انسان کے ذہن و قلب کو مرعوب بھی کر سکتا ہے۔ اور اپیل بھی۔ میں اس جگہ شعریت و موسیقیت کے بارے میں تفصیل سے بحث کرتا لیکن مضمون کی طوالت دامن گیر ہے۔ اس مضمون میں جتنے اشعار پیش کیے گئے ہیں ان سے اس اعتراض کی صداقت کا پتہ چل سکتا ہے۔

غرض کہ یگانہ اردو کے اہم اور ممتاز غزل گو شاعر ہیں، انھوں نے اردو غزل کو فکر و خیال کی جوندہ رت، اخبار کی جو جرات اور نیکی اسلوب کی جو انفرادیت اور لہجہ کی جو نئی جھنکار دی ہے۔ وہ کسی طرح نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ چہر زبان محاورہ۔ روزمرہ اور عرفی پران کی قدر

اندروں بھی حاکمانہ قدرت کا جواب نہیں ہے، اچھے اچھے کہنے شناسا تذکیر کہیں چوک جاتے ہیں، لیکن یگانہ ہی ایک ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں فنی لغزشیں شاید ہی کہیں نظر آئیں، عروض و قوافی کے لحاظ سے تو اس پر کہیں کوئی انگلی رکھ ہی نہیں سکتا، وہ بڑا نابغہ و طبع (ادب بڑا بیدار مغز شاعر تھا، جو وقتی ہنگاموں اور بد میں ضرب المثل محاورہ بندہ اور زبان کے پیروں کی نذر ہو گیا، اور اردو ادب کو جتنا چلبے تھا، نہ دے سکا۔ اس کی تصنیف "چراغ سخن" اہل بنیش اور ارباب۔ بھرت کے لیے شعل ہدایت کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں عروض کے باریک سے باریک نکات و غوامض عام فہم انداز میں سمجھائے گئے ہیں۔ مختصر یہ کہ یگانہ کا نام فہرست میں تیسرے یا چوتھے نمبر پر تو رکھا جاسکتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس سے اس سے چٹم پوٹی کی جائے۔ یا آسے تفرانہ نہ کر دیا جائے۔

چند علمی ادبی کتابیں

دستور الفصاحت (یکتا)	مرتبہ مولانا عرشی	روپے مجلد
فرہنگ غالب	مرتبہ مولانا عرشی	روپے مجلد
سفر نامہ مخلص	ڈاکٹر سید اظہر علی	روپے مجلد
نادران شاہی (شاہ عالم ثانی)	مولانا عرشی	روپے مجلد
وقائع عالم شاہی (ذوق)	"	روپے "
سلک گوہر (انشاء)	"	روپے "
متفرقات غالب	پروفیسر حسن رضوی	روپے مجلد
اوراق گل	ضمیمہ ہاشمی	روپے "
رامپور انتھالوجی	"چپ مین	روپے "
	نگار بک ایجنسی رامپور، یوپی	

میرزا محمد فاضل میکس

سید نقی احمد ارشاد

سال ولادت ۱۳۸ ہجری بہ روایت سفینہ ہندی اور ۱۱۳۶ھ بہ روایت میرزا میکس۔ قیام دہلی۔ از پیدائش تا ۱۱۷۰ھ بہ روایت لال انیس اور ۱۱۷۴ھ بہ روایت نشتر عشق درد و لکھنؤ۔ ۱۱۷۴ھ پہلی مدت اقامت ۱۱۷۰ھ سے لغایت ۱۱۸۲ھ۔ درد و فیض آباد ۱۱۸۲ھ۔ روانگی آباد ۱۱۸۲ھ۔ قیام آباد ۱۱۸۲ھ سے لغایت ۱۱۸۴ھ۔ مراجعت و قیام لکھنؤ ۱۱۸۵ھ سے تار حلت ۱۲۲۱ھ۔ سفر بجنور ۱۱۸۶ھ۔ سفر بنارس ۱۱۹۲ھ اور ۱۱۸۳ھ۔ جائے دفن۔ باغ چینی لال متصل کر بلے اٹھاس علی خاں لکھنؤ۔

میرزا محمد فاضل میکس کے حالات زیادہ تر چار کتابوں میں ملتے ہیں ۱ تذکرہ انیس الاحباب مولفہ لال انیس شاگرد افتاحیہ ۲ میرزا محمد فاضل میکس ۳ نشتر عشق مولفہ حسین قلی خاں عظیم آبادی ۴ سفینہ ہندی ۵ گلزار جعفری۔ مجموعہ خطوط میرزا میکس مرتبہ نواب جعفر خاں راعی ابن ہدایت اللہ خاں ابن لطف اللہ خاں صادق میر سامانی محمد شاہ۔

مذکورہ بالا تین کتابوں کے قلمی نسخے خدا بخش خاں کی لائبریری ٹیٹنہ میں موجود ہیں۔ گلزار جعفری کا ایک قلمی نسخہ راجہ شتاب رائے کے پوتے کزور حشمت عرف ڈھوراجہ کے حمدت میں راقم آٹم کے پاس موجود ہے۔ اس کا سن کتابت ۱۲۴۷ھ فصلی ہے۔ نسخہ راقم کے جد مرعوم شاد عظیم آبادی کے ذاتی کتب خانے میں تھا۔ ۱۹۳۸ء میں جب ٹیٹنہ کالج میں تاریخی نمائش ہونے لگی تو استاذی جناب سید حسن عسکری صاحب مدظلہ متوجہ تاریخ ٹیٹنہ کالج نے مجھ سے لیکر یہ نسخہ مع تاریخ منظری کے اصلی نسخے کے اس کو نمائش میں پیش کیا۔ چنانچہ اس کا ذکر اس سال کے ٹیٹنہ کالج میگزین میں موجود ہے۔ تاریخ منظری کا اصلی مسودہ سید صادق حسین بہال مرعوم (شاد کے سہانچے) کی ملکیت تھا۔ بعد نمائش میں نے اس کو واپس کر دیا۔ ان مرعوم کا ۱۹۴۵ء میں انتقال ہو گیا۔ اور اس کے بعد اس نسخے کا پتہ نہیں چلا۔ گلزار جعفری کا نسخہ سبب امتداد زمانہ میرمنے پرنس فیاض الدین حیدر شہید فارسی ٹیٹنہ کالج کے حوالے کیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۶۰ء میں انھوں نے اس پر ایک مقالہ لکھا جسے مجھ علم اسلام علی گڑھ نے ۱۹۶۰ء میں شائع کر دیا ہے۔ ٹیٹنہ کالج کی تاریخی نمائش میں گلزار جعفری کا نمبر [P. ۲۰] تھا اور تاریخ منظری کا [P. ۲۱]۔ شاد کی والدہ عارفہ بیگم لطف اللہ خاں صادق کی اولادوں میں تھیں۔ لطف اللہ خاں صادق کی اولادوں میں نواب شاکر خاں صاحب گلشن صادق، نواب جعفر خاں راعی، اور محمد علی خاں انصاری صاحب تاریخ منظری ٹیٹنہ چلے آئے تھے اور یہیں بود و باش اختیار کی تھی۔ ان کا خاندان شاد کے خاندان سے ملحق ہو گیا۔ اسی سبب سے اس خاندان کی بعض بعض قدیم چیزیں خاندان شاد میں موجود ہیں۔ فیاض الدین حیدر صاحب کا مقالہ نہایت تشدد ہے اور بعض جگہ کی عبارت واقعات تاریخ سے غلط ہے۔ لہذا تفصیل سے کل حالات ایک جا پیش کیے جاتے ہیں۔ غالباً مجھ سے پہلے آج تک میرزا میکس پر کسی نے اس تفصیل سے مضمون نہیں لکھا ہے۔

نشتر عشق کی عبارت ہے ”دہلوی اصلش از بود۔ جد کلاش مسیحی بہ آقا عبدالرحیم ہمراہ نواب علی مردان خاں بہ بندوشتا میرزا کے اجداد“ سیدہ درد دہلی باد اقامت کشید“ میرزا کے پردادا نواب علی مرزاں حاکم قندھار کے ہمراہ ہندوستان آئے اور دہلی میں بود و باش اختیار کی۔ میکس کے دادا آقا عبدالکریم کی شادی ملا قاسم کاہی کی بیٹی سے ہوئی۔ عبدالکریم علی مردان خاں کے بیٹے کی سرکار سے دالبرہ ہو کر کثیر چلے گئے۔ کثیر ہی میں میکس کے باپ آقا محمد شریف پیدا ہوئے۔

یہ نشتر عشق کی عبارت کا ترجمہ ہے۔ مگر تاہم انہوں سے پتہ چلتا ہے کہ خود علی مردان خاں کو کثیر کی صوبہ داری تنوین ہوئی تھی۔ مگر الامرا کی عبارت ہے ”از دہلی عارف علی مردان خاں را (کتاب دہلی) ایران خو گرفتہ کتاب و لقب ہندوستان نداشت“ یہ صاحب ہو گئی کثیر جنت نظر مورد

نفضل فرمود علی مردان خاں نے شاہ صفوی شاہ ایران کے عہد کی فرائض کی حکمرانی خیریت اس میں چاہی کہ وہ شاہجہاں بادشاہ ہندوستان کی پناہ میں آجائیں۔ چنانچہ انھوں نے حکومت قندھار شاہجہاں کے حوالے کر دی اور افغانستان حکومت ایران سے باہر ہو گیا۔ اس کے صلے میں شاہجہاں نے انہیں حکومت کشمیر دی۔ بعد کو جب شاہجہاں نے ترکوں کی سرکوبی چاہی اور اورنگ زیب کی کان میں تلخ میں فوجیں بھیجیں تو علی مردان خاں اورنگ زیب کے ساتھ تھے۔ کہتے ہیں کہ تلخ کی لڑائی میں سات ہزار ترک مارے گئے۔ شاہجہاں نے خوش ہو کر علی مردان خاں کو حکومت پنجاب بھی بخش دی۔ علی مردان خاں کے بعد حکومت کشمیر ان کے بیٹے صاحبزادے ابراہیم علی خاں کو ملی۔ اس زمانے کے امرا کا یہ قاعدہ تھا کہ جہاں خود جاتے تھے ان کے متوسلین ان کے ساتھ جاتے تھے۔ اس لیے قرینہ یہی ہے کہ میرزا میکس کے اجداد نے کشمیر میں سکونت اختیار کر لی ہوگی اور قیام دہلی بعد کو ہوا ہوگا۔

یہ تذکرہ لالہ موہن لال انیس قوم کھتری نے میرزا میکس کی زندگی میں مرتب کیا تھا۔ انیس خود میرزا کے شاگرد تھے۔ اور انیس لالہ موہن لال انیس کا ایک خط بنام لالہ موہن لال انیس کا یہ تذکرہ نویں لالہ موہن لال انیس کا میاں با شہنشاہ سے ظاہر ہوتا ہے اس تذکرہ کا علم میرزا میکس کو تھا۔ نثر عشق کے بیان میں اوراد و خامیاں ہیں جن کا ذکر بعد میں آئے گا۔

انیس الاحباب تے میرزا کے مرنے پر کئی کئی ہفتے بعد حلت کی۔ لہذا انیس الاحباب کی تحریر بہ نسبت نثر عشق کے زیادہ دیرنی ہے۔ اس کی نگار جعفری سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک خط بنام لالہ موہن لال انیس میں مرزا تحریر کرتے ہیں "درست جتنی باب تذکرہ نویں لالہ موہن لال انیس کا میاں با شہنشاہ سے ظاہر ہوتا ہے اس تذکرہ کا علم میرزا میکس کو تھا۔ نثر عشق کے بیان میں اوراد و خامیاں ہیں جن کا ذکر بعد میں آئے گا۔

سال پیدائش سفینہ ہندی کے مطابق میرزا محمد میکس کا سال ولادت ۱۱۳۸ھ ہے مگر اس کی مطابقت میرزا کے اس قیدے سے پہلا اختلاف نہیں ہوتی ہے۔ چونکہ نگار جعفری میں موجود ہے۔

پس از سپاس خدا و ثنائے پغمبر
چلند بہ منزل چہلم مسافر عمر
گشتہ بود ہنگام ہجرت نبوی
شہدیت کے حال بندہ احقر
گفتہ بخاطر من کرد شوق سیر و سفر
تبرار بکھند و ہشتاد و دو سالگر

۱۱۸۲

اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۱۸۲ھ میں میرزا کی عمر چالیس سال کی تھی۔ گو یا ان کی پیدائش ۱۱۴۲ھ میں ہوئی۔ میرزا دہلی میں پیدا ہوئے۔ ادا اس میں کسی اختلاف نہیں ہے۔

اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ میرزا میکس میرزا علیا صفہانی اکثر کے شاگرد تھے۔ معنی استاد و اخاذ کرتے ہیں۔ کہ وہ فوت خاں کھتری سے اصلاح لیتے تھے۔ نگار جعفری میں استاد شاگردی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

قیام دہلی میرزا نے دہلی کب چھوڑا اس میں اختلاف ہے جعفر خاں راعب کے حال میں انیس الاحباب کی عبارت ہے "چندے پیش از ہجرت ابدالی بہ لکھنؤ آمدہ قیام نمودہ بودہ در آں ایام بہ ادادہ شاگردی ارشاد پناہی سادت ملازمت حاصل نمودہ اور پناہی سے مراد میرزا میکس۔ اس عبارت میں یہ صاف نہیں ہے کہ ابدالی کے کون سے جلسے سے پہلے جعفر خاں راعب لکھنؤ چلے آئے۔ ابدالی کا پہلا حملہ ۱۱۶۱ھ میں ہوا۔ اس عبارت میں ابدالی کو صفد جگ نے شکست دی تھی۔ ابدالی کا دوسرا حملہ ۱۱۷۰ھ میں بہ عہد عالم گیر ثانی ہوا۔ اس دفعہ ابدالی صاحب بیگم دختر محمد شاہ کو قند کے اپنے ساتھ لیتا گیا۔ ابدالی کا تیسرا حملہ ۱۱۷۴ھ میں شاہ جہاں دہلی کے عہد میں ہوا۔ دہلی پر یہ دوسرا حملہ تھا۔ نثر عشق میں میرزا میکس کے حال میں لکھنؤ "بعد تخریب دہلی از دردد مکرر ہو کہپ احمد شاہ درانی خرامیدہ بہ لکھنؤ رسیدہ بود و باش گرفت" اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۱۱۷۴ھ کے بعد میرزا میکس فارغ لکھنؤ ہوئے۔ مگر یہ غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ لالہ موہن لال انیس کے مطابق جعفر خاں راعب ابدالی کے ہنگامے کے پہلے لکھنؤ آئے اور میرزا کے شاگرد قرینہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۷۰ھ یا ۱۱۶۹ھ سے لے کر ۱۱۷۴ھ کے درمیان میرزا میکس فارغ لکھنؤ ہوئے۔ اس کی تصدیق خود میرزا کے ایک خط سے ہوتی ہے جس میں انھوں نے میرزا اشرف علی خاں خاں کا واقعہ لکھا ہے۔ یہ خط نمبر ۸۹ نگار جعفری بنام میر محمدی غیرت ہے۔

یہ دہلی تھے۔ چنانچہ انیس الاحباب کی عبارت ہے: "سید علی فطرت میر محمد غیرت از فرزند ان سالک سالک بیکٹی واقف اسلم دہلی شاہ وقت اللہ قضا مدد و مدد حضرت سید الشہداء در ہنگامہ احمد شاہ درانی بہ نجات رفتہ" میر محمدی غیرت کا تعلق

میر محمدی غیرت

دیاست بیورہ سے ہو گیا۔ چنانچہ میرزا ان کو اپنے خط میں لکھتے ہیں: "اشرت علی خاں کو گرفت و انقلاب زمانہ و بھوائے ارمو اکما شاعر و قوم دل و مضمی قوم اخضر و عالمی
یہ لقب البھال محل ترجم خویش و بیگانہ اند۔ بازیکچ فطل مزاج باشند اتفاق افتاد"

اسی میں میں میر علاء الدولہ اشرت علی خاں مولف مذکورہ الشعار بھی گزرے ہیں۔ مگر بازیکچ فطل مزاج با" کا اشارہ اس واقعے کی طرف معلوم ہوتا ہے۔
جب شجاع الدولہ نے عالم اختلاف میں بقول مصحفی "فخاں کا ہاتھ مٹانے کے پیسے سے جلاوا دیا گیا تھا اور فیض آباد سے برخواستہ خاطر ہو کر وہ عظیم آباد ۱۱۷۱ھ میں چلے
گئے تھے۔ بقول صاحب فشرع "من بعد در ۱۱۷۱ھ پشہر عظیم آباد رفتہ بدرجہ شتاب رائے توصل جنت" فخاں کی موجودگی میں فیض آباد میں ۱۱۷۱ھ سے
نایت ۱۱۷۰ھ تک ثابت ہے (دیکھو مقالہ ارشاد نواب میرزا اشرت علی خاں فخاں مطبوعہ معج فوٹو جولا ۱۹۶۳ء) اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ میرزا میکس ۱۱۷۰ھ
میں لکھنؤ میں موجود تھے۔

قیام دہلی ۱۱۳۸ھ

سے ۱۱۷۰ھ

ان میں الاحباب کی تحریک ہے۔

جسٹیا اور پرتحریر ہوا۔ اگر میرزا کا سال ولادت ۱۱۳۸ھ مان لیا جائے اور وہ ۱۱۷۰ھ تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ ۳۲ سال کی
عمر میں میرزا نے دہلی کو چھوڑا۔ اس زمانے میں میرزا کی دوستی وجیہ الدین خاں بریں کشمیری سے ہوئی۔ وجیہ الدین خاں کے
بڑے بھائی کا نام حسام الدین خاں تھا جنہیں شاہ عالم نے حسام الدولہ کا خطاب دیا تھا۔ وجیہ الدین خاں کے متعلق

وجیہ الدین خاں

اور حسام الدین خاں

"در شاہجہاں آباد از عنقوان جوانی بخدمت ارشاد پناہی حاضر شدہ استفادہ علم دہر می نمودن این کہ زبان بگفتن اشار کشودن
ان کی دوستی میرزا کے الہ آباد و فیض آباد میں کام آئی۔

حسام الدین خاں نام ہے اور حسام الدولہ خطاب۔ وجیہ الدین خاں بریں شاگر میرزا کا بڑا بھائی تھا۔ اور محمد علی خاں
متین مولف تحیات الشعراء کا باپ سیر اور تاریخ مظفری کے مطابق حسام الدولہ ان پڑھ شخص تھا۔ بکر اور غرور کا پتلہ تھا۔ تمام امرائے دربار اس سے نفرت
کرتے تھے۔ یہ دونوں بھائی شاہزادے گوہر (شاہ عالم شاہ) کے ساتھ سلیم کی طرح دہلی سے الہ آباد تک رہے اور الہ آباد سے دہلی تک گئے۔ رضا علی خاں
میر الدولہ سے اور حسام الدین سے ان بن رہتی تھی۔ اسی وجہ سے میر الدولہ مراحت الہ آباد کے وقت بادشاہ کے ساتھ دہلی نہ گئے اور ۱۱۸۳ھ میں ٹپہ چلے
آئے۔ میر الدولہ نے ٹپہ میں رحلت کی۔ اور ان کی قبر باولی ہال محلہ گزری ٹپہ شہر کے صحن کے شمالی گوشہ میں ہنوز موجود ہے۔ اس عمارت میں اب مہلک ٹپہ
کا اسپتال ہے۔ اور حکومت نے یہ عمارت میر الدولہ خرید لی ہے۔

حسام الدین اور وجیہ الدین دونوں بھائی کشمیری تھے۔ حسام الدولہ نے میر الدولہ کو معتب کر کے راجہ رام ناتھ کی میت میں کل انتظام اپنے ہاتھ میں لے
لیا تھا۔ یہ واقعہ آباد کا ہے۔ یہ راجہ رام ناتھ شاہ عالم کا الہ آباد میں دیوان بومات تھا۔ کچھ دنوں کے بعد حسام الدولہ نے راجہ رام ناتھ کو بھی اکھاڑ پھینکا۔ پوئیر
جاس جہد کا موثر ہے "شاہ عالم" میں اس کا نہایت بڑے غفلوں میں ذکر کرتا ہے۔ دہلی پہنچ کر حسام الدولہ نے مرہٹوں سے بھی سازش کی ہے۔ آخر میرزا
نجف خاں نے اس کی ساری سازشوں کا حال کھولا۔ حسام الدولہ سے بادشاہ کے بخیہ ہونے کا یہ بھی سبب ہوا کہ الہ آباد سے دہلی تک بادشاہ کو پہنچانے کے لیے
جس رقم کا مرہٹوں سے وعدہ ہوا تھا اس کو ادا کرنے کے لیے بادشاہ نے حسام الدولہ کی معرفت ۳ لاکھ کے زیورات گردی کرائے تھے۔ حسام الدولہ نے یہ زیورات
دیا رکھے۔ تاریخ مظفری سے پتہ چلتا ہے کہ حسام الدولہ کو بادشاہ نے راجہ رام ناتھ کی معرفت بلوا کے دلائل کی امانتی اثرفیوں کے بدلے ارک میں قید کیا۔
دوسری روایت ہے کہ بادشاہ کی اجازت سے میرزا نجف خاں نے حسام الدولہ کو دربار سے نکلنے وقت گرفتار کیا۔ راجہ رام ناتھ نے اس وقت حسام الدولہ سے
الہ آباد کا بدلہ لیا۔ اور اسے ۴۰۰۰ روپے اور ۱۱۸۷ھ کو سلیم گڑھ میں نظر بند کیا۔ نجف خاں نے بد گرفتاری حسام الدولہ سے ۱۰ لاکھ روپے وصول کیے جنہیں سے اپنے
نے چھ لاکھ اپنی فوج میں تقسیم کر دیے اور ۱۱۸۷ھ لاکھ بادشاہ کے حوالے کیے۔ دہلی میں حسام الدولہ نے نواب محمدا الدولہ خاں دوراں خاں کے محل پر قبضہ کر لیا تھا۔

میرزا علی خاں

میرزا کے شاگردوں میں تھے ان میں الاحباب کی عبارت ہے۔ "میر غالب علی شائق سید زادہ ہندوستان دوست و سالہ
نارسی راجناب ارشاد پناہی سند کردہ شعر و شاعری نامے برآوردہ۔ سابق میکس نگہ می کرد۔ از چندے بہ موجب
فرمودہ شاہ عالم پناہ شائق قرار دادہ بود۔ علا شہیدہ شد کہ سید شخص می نماید۔ یہ وہی غالب علی خاں ہیں جن کا ذکر دفاع عالم شاہی مصنف کنور پریم کٹور فراتی میں

آیا ہے۔ بادشاہ نے سید الشعراء کا خطاب دیا تھا۔ بادشاہ کے سفر جے پور میں یہ ساتھ تھے۔ دوران سفر میں ایک دن ادبی محفل گرم ہوئی۔ غالب علی خاں نے میرزا محسن تاثیر صوفی کے مطلع پر مطلع کہہ کے پڑھا۔ تاثیر صوفی کا مطلع ہے

باز در عشق تو دارم سر داود دستدی
کہ دہم افسر شاہی بہ کلاہ مخدی
سید کا مطلع ہے
بوسر خواہم ز لیش یکٹے کی دادہ صدی
ہست زان سادہ مرا خوش سر داود صدی
بادشاہ سلامت نے فرمایا کہ دادہ دستد سے خواہ حافظ کا یہ شعر یاد آگیا

یہم روضہ حینت بدو گندم بہ فروخت
ناخلف باشم اگر منی بجستے نفرد شتم

گلزار جعفری خط ۱ صفحہ ۱۹۔ بنام سلف علی خاں بنارس سے پتہ چلتا ہے کہ جب میرزا محمد خان بنارس میں موجود تھے تو ایک دن میر غالب علی خاں ان کی ملاقات کو آئے۔ کہتے ہیں عزیزے اردوستان قدیم، ابن بچھاں بہ ملاقات سامی رسیدہ خوبی خود انہما حق محبت گذشتہ کردہ اند۔ بلے بجا دار ہمیں شایہ است۔ میر غالب علی نام دارند

لکھنؤ میں اس زمانے میں میرزا کا قیام سرانے شجاعت خاں میں تھا۔ جب گلزار جعفری کے خطوط سے پتہ چلتا ہے۔ اسی زمانے میں نواب جعفر خاں راعی مرتب گلزار جعفری اور ان کے بھائی محمد علی خاں انصاری صاحب تاریخ مظفری میرزا کے شاگرد ہوئے۔ انیس الاحباب کی عبارت ہے۔

محمد جعفر خاں راعی سلمہ اللہ ولد نواب ہدایت اللہ خاں مرحوم بنیرہ نواب شمس الدین سلف اللہ خاں صادق دہلیہ عزت الدولہ شیرانگل خاں محمد شاہی از دولت مند زادہ ہائے عمدہ منش ذوالقدر۔ از مغربی بکلام رعیت تمام دارندیکمال بروی و خصال حمیدہ آراستہ و پیرایہ عزت و اعتقاد پیراستہ۔ از دار الخلافت شاہجہاں آباد چندے پیش از ہجرت ابدالی لکھنؤ آمدہ قیام نمودہ بودند در راں ایام بہ ارادہ شاہ گدھی اور شاہ پناہی سعادت ملازمت حاصل نمودہ الحال از دہلی بحسب اتفاق زمانہ در عظیم آباد تشریف بردہ ان دیار مذکور بہ شہرت حسن اخلاق و دریں دیار ثقات عالیہ است مع بعضی رفقای فیض انجناب را بشوق تمام و رغبت و محنت از جابجا ہم رسا بنیدہ نسخہ تالیف نمودہ موسوم بہ گلزار جعفری

گلزار جعفری کا علم لادہ بہن لال کے علاوہ خود میرزا محمد خان بنارس کو بھی تھا۔ صفحہ ۲۰۲ خط بنام راعی تحریر کرتے ہیں

"نقلش ملفوف است بتال مشاموڈہ در گلزار جعفری بہ نو سید"

اس زمانے یعنی ۱۱۷۰ھ سے لے کر ۱۱۷۴ھ تک محمد علی خاں صاحب تاریخ محمدی و مظفری بھی لکھنؤ میں میرزا کے شاگرد ہوئے اس کے بعد بقول فیض الاحباب بحسب اتفاق زمانہ پسر نفاق بہ تقاضائے بخودش بطرف عظیم آباد رفتند و دوا بنجا شغل دیگر گرفتند مگر بہ مطالعہ تاریخ زنداوردہ۔ اخوان سن بستم از جلوس شاہ عالم عالی گوہر بادشاہ غازی بطریق اجمال مرقوم نمودہ اند بہ تالیف محمدی موسوم

گلزار جعفری صفحہ ۲۰۷ میں ایک خط میرزا بنام محمد علی خاں موجود ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تاریخ محمدی کے دیباچہ پر میرزا کی اصالت ہے۔

مسودہ دیدہ و سنجیدہ مرسل شد

میرزا مونی منش اور تارک الدین تھے۔ لکھنؤ میں سرانے شجاعت خاں میں رہتے تھے گھر کے درگاہ سید اشرف کی زیارت کو چلے

ورد فیض آباد

پڑے۔ ۱۱۸۲ھ میں فیض آباد پہنچے۔ لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں وہ سرانے شجاعت اور سرانے داد سرایوں میں رہتے تھے وہاں سے نکل کے فیض آباد پہنچے بعد ورد فیض آباد چند دنوں سرانے پور میں پڑے جس کے متعلق ایک مسجد تھی اور یہ جگہ میرزا کے موافق حال تھی۔ کیونکہ عبادت شب بیداری کی آسانی تھی۔ میرزا تندرست و نیا کے تھے۔ قابل تھے اور برابر لیا جائے کرام کے مزارت کی زیارت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ماہ محرم میں راعی کا خط لکھا میرزا نے جواب دیا

خطوط سامی مکہ و مدینہ ایم حشرہ رسیدہ۔ چوں بے حسی بسبب ناخوشخوئی تفریب و اشتہم جواب آں موقوف بر فرحت گذشتہ سفر قبض آباد کا حال تھا۔ صفحہ ۱۰۶ بنام راعی میں تحریر کرتے ہیں۔

احوال خود چہ نویسم۔ در ماہ جمادی الاخرہ ارادہ درگاہ سید اشرف نمودہ بعضی رفقاء و اساتذہ یار میرزا کے

یونس سختی بخوار من ناگفتی سے مراد اسمہال کی شکایت۔ میرزا کے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں برابر دست آتے تھے اور غالباً اسی وجہ سے کسی ذی رتبہ شخص کے گھر میں بٹرنے کے بجائے وہ سرائے کو پسند کرتے تھے۔

"اکابرزادہ شہیدہ پیغام و سلام شروع کر دے۔ آخر در خواست ملاقات نمود۔ جواب نام کہ من مسافر سر راہم معاف دارند۔ دست برد داشت۔ ارادہ آمدن کرد مانع آمد۔ چوں ازیں خیال باز نیامد گفتہ فرستادم کہ پنج شنبہ بدرگاہ حضرت شہید رحمہ فرام رفت۔ شہارم بیامید۔ بعد گرامی بنیم دے چند باہم می نشینم۔ میرزا نے اس خط میں اکابرزادے کا نام نہیں کھولا ہے۔ بہر کیف اس اکابرزادے نے سواری شتر (اونٹ) اور راجہ سفر کا انتظام کر دیا اور میرزا اونٹ کی سواری سے درگاہ شہید و درگاہ سید اشرف کی زیارت کو گئے۔ وہاں کچھ جہاں مزار سید اشرف ہے۔ میرزا نے آٹھ دنوں تک قیام کیا اور پھر فیض آباد چلے آئے۔ یہاں برہان علی خاں رہن کے چچا ان کے منتظر تھے۔ اپنے گھر لے گئے اور یہاں کیا۔ میرزا نہ مانے اور چند دنوں کے بعد پھر سرائے یونس میں واپس چلے آئے تاکہ اسی سرا میں مسجد کے منقل رمضان کے دن اطمینان سے گذاریں۔ ایک دوسرے شاگرد خواجہ یحییٰ خرد کو خبر ہوئی اور وہ میرزا کو اپنے گھر لے گئے۔ ابھی رمضان کے تیس روز بے بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ میرزا پھر سرائے یونس کی مسجد میں واپس چلے آئے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب اسمہال میرزا تنہائی پسند کرتے تھے۔ یا ان کی خودداری کسی کی مینافیت قبول نہیں کرتی تھی۔

ورود شاہ عالم در فیض آباد ۱۱۸۲ھ کی آخری تاریخوں میں شاہ عالم فیض آباد پہنچے۔ اس سفر میں وجہ الدین خاں برہن میرزا خاں فیض آباد کے لیے روانہ کیا۔ آخر انہوں نے میرزا کو سرائے یونس کی مسجد میں پایا۔ میرزا نے حضور شاہی میں جانے سے انکار کیا۔ آخر وجہ الدین خاں تنہا ملنے کو اس سرا میں آئے۔

آخر رمضان برخواستہ و مسجد نشستم و خیال رفتن بخانہ خود بود۔ اما صورت نمی گرفت۔ دریں اثنا بادشاہ در فیض آباد رسیدہ اشٹائے قدیم کہ وجہ الدین خاں نام دارند و برہن تخلص دے ادا ادا احوال فقیر شہیدہ بعرض بادشاہ رسانیدہ بودند کہ قدوی راہم ذکر کباب باید کرد کہ فلانے در فیض آباد است۔ ملاقاتش از زور دام۔ تا بد بسبب خاں سامانی خاص بادشاہ می خواستند کہ ہمراہ شوند۔ چنانچہ برادر کلان ایشان حاتم الدین خاں کہ رکن سلطنت است در ادا آباد ماند۔ میرزا نے اس وقت ادا آباد جانے سے انکار کیا۔ اور بادشاہ کے حضور میں نہ گئے۔ بلکہ یہ کہہ کر چند دنوں بعد میں روانہ ہوں گا۔ چنانچہ وجہ الدین خاں نے ایک دستہ اور چند پیادے چھوڑ دیے۔ رکتہ و چند پیادہ و دستہ پیالہ گداشتہ رفتند۔ چوں خاطر ایشان عزیز بود از دنبال روانہ شدند تا آنکہ نعمت در ادا آباد رسانید۔ دنبال کے معنی ہیں پیچھے پیچھے روانہ ہونے کے۔ اسی زمانے میں نواب احمد علی خاں کا اقبال فیض آباد میں چمکا ہوا تھا۔ جن کا ذکر اس مجموعہ حکایار جعفری میں کئی جگہ ہے۔ فیض آباد سے روانہ ہوتے ہوئے میرزا نے وہ مشہور قصیدہ کہا جس میں ان کے تمام احباب اور شاگردوں کا ذکر ہے اس کے شروع کے دو شعر لکھ دیے گئے۔ آگے اور اشار پیش کیے جائیں گے۔

رداں ز خانہ شدم ناگہاں فیض آباد دواں فتاد مرا جانب کچھو چھو گند
بس از زیارت درگاہ سید اشرف کشید دل بہ ہواں شہر از قضا و قدر

ادا آباد پہنچ کر بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوئے۔

اسی زمانے کی ایک محبت کا ذکر خط سست صفحہ ۳۷ بنام راعب میں کرتے ہیں۔

ورود الہ آباد حضور ظل سبحانی دست برہن دارند۔ ناچار روزے برائے خاطر خان مہربان جان عیان وجہ الدین خاں سلمہ ربہ بخنور بعد نکرار دقت

دیدند بہ دشمن عمد فقر گرانست کز بال ہما آ رہ کشیدند سرم را

بسیار سلوک بہ عمل آوردند چنانچہ موافق وعدہ کہ معرفت راجہ رام ناسخہ کردہ بودند خود بہ مجرور رسیدن بنفیر فرمودند کہ بہ نشینید متقل نشستم۔ بہ شاشت گفتند مایک

دو مطلع خود بدولت فرمودہ ایم" از جیب خاص برآوردہ و خود خواندہ گفتند کہ شامتہ بگوئید۔

کہتے ہیں کہ بادشاہ نے راجہ رام ناسخہ کی معرفت وعدہ کیا تھا کہ میرزا کے ساتھ حب مرا تب علمی سلوک کیا جائے گا۔ تب میرزا حاضر خدمت ہوئے۔ بادشاہ

وقت تہا استقبال کے لیے آئے۔ میرزا کو بیٹھنے کو کہا اور میرزا بادشاہ کے پاس بیٹھ گئے بادشاہ نے خوش ہو کے کہا میں نے دُتین مطلع نظم کیا ہے تم غنمہ کرو۔
 بیاب سے ایک پرزہ نکالا اور پڑھا۔

گنم بہ سر و چشم دشتہ ماندہ۔ راجہ دغان ماکہ ہمراہ بردہ ہوا۔ غرض فقیر آداب تسلیم کر دند یعنی

موسیا آداب دانان دیگر اند
 سوختہ جاں درد آناں دیگر اند

غرض تین چار گھڑی صحبت رہی۔ یہ سختی تقریب شاگردی۔ بادشاہ نے اٹھتے ہوئے راجہ رام ناتھ کی طرف اشارہ کیا۔ راجہ رام ناتھ نے بشتیہ کا ایک دو پارچہ
 مجھے میں پیش کیا۔ میرزا نے پوچھا "پیرسیدم جیت؟" راجہ رام ناتھ نے کہا "عنایت حضور! میرزا نے کہا" عنایت برائے اس میں لطف ملاقات کا نصبت و آں بہ عمل
 مد النعم من میرزا نے طوعاً و کرہاً وہ علیہ خصوصی قبول کر لیا۔ مگر اٹھتے ہوئے فی البدیہہ یہ رباعی راجہ اور قاضی کے سامنے کہہ کر بیٹھی

در خدمت شاہ عالم دہالمیاں
 بنشت اگر میکس مزین طعنے برآں

ناچار فتنہ ز خاک و مایہ
 برخاک بیٹھ آفتاب تاباں

و روایت خود میرزا میکس نے لکھی ہے جو گلزار جعفری میں موجود ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حسین قلی خاں مروم نے نسو گلزار جعفری کو نہیں دیکھا، اسی وجہ سے
 شتر عشق میں ایک دوسری روایت لکھ دی ہے جس کی تصدیق کسی اور تذکرے سے نہیں ہوتی ہے۔ میرزا کی اس تحریر کے بعد شتر عشق کی اس عبارت کا کوئی
 ذکرن نہیں ہے۔

"ہنگامے کہ شاہ عالم فردوس نزل بہ الہ آباد تشریف می داشتند احوال فصاحت شعاری میرزا شنیدہ چند مطلع خود در لکھنؤ نزد ایشان فرستادند"
 میرزا کے مطابق یہ واقعہ الہ آباد میں پیش آیا۔ اور حسین قلی خاں کہتے ہیں کہ بادشاہ نے اپنے مطلعے میرزا کی خدمت میں لکھنؤ میں بھیجے پھر کہتے ہیں "میرزا
 بیات آل مطلع را بے مقاطع غزلیات درست کردہ بخلاف ارسال داشت۔ بعد رسیدن غزلیات بہ نظر سلطانی فکر و طبع میرزا پیش دالہ متحکم و مرغوب
 و دید و گفتگو از لکھنؤ بہ اودم متحرک شدہ بود فرمان طلب حضور می مدد دریافت۔ میرزا اکلر بند شد و الہ آباد رسیدہ و میلانیت شاہی مشورت شد و پروا نگاہ و نشستن یافت
 و درال باب اس رباعی فی البدیہہ گفتم بفرمن رسانیدہ۔ در خدمت شاہ عالم دہالمیاں۔ الخ۔
 اپنے دیکھا کہ دونوں روایتوں میں کتنا فرق ہے۔

اس کے بعد اس علیہ شاہی لکھا نجام ہوا خود میرزا کی زبان سے سنیے۔ میں نے ادھر پوچھ کر روایت سے بیان کیا کہ حسام الدین خاں
 عطیہ شاہی بڑا جاہل اور معزز شخص تھا۔ جب اس نے یہ دیکھا کہ ایک مرد فقیر بوریا نشیں جو سرا میں زندگی گزارتا ہے بادشاہ کا استاد ہو گیا تو اس
 سے نہ ہوا گیا۔

"پس از چند روز حسام الدین خاں بہ گرم ہوشی آمدہ گفتند کہ شنیدہ ام شام شوق سرور شنیدن بسیار دارم و بدو زے بگوئید بملحقے اند سازندہ نوکر فرستاد
 و تا خیال بائے کہ من درست کردہ ام بشنوائند گفتم کہ چہ مضائقہ حسام الدین خاں میرزا سے ملے اور کہا میں نے سنا ہے تم گانا پسند کرتے ہو۔ کہو تو
 کار سازندہ کو بیجہ دوں تاکہ جو خیال میں نے باندھلے وہ بھی سن لو

خیال کی راگنی جسے میاں کی ٹوٹی بھی کہتے ہیں۔ اس کے موجد حضرات امیر خسرو علیہ الرحمۃ صلی اور بہ موصوفیہ اکرام میں نہایت مقبول
 خیال اور غزل ہے۔ غزلیں عام طور سے سی راگنی میں گائی جاتی ہے۔ چنانچہ شیخ سعدی کی حروف صنعتی دالی غزل اسی راگنی میں نہایت مقبول ہوئی
 و آج سے چار سال پہلے ملک اکثر امرا کی محفل میں بہ ذوق و شوق گائی جاتی تھی۔

لے بہ بالا چوں منور دے رخت لچمیم وہ
 زلف داری ہچو عنبر لب چو شبنم دک در

آفتاب عاشقان دماہتاب دہراں
 قبل اُداد کافی اے صنم بار درخ

شاعراں بسیار گفتہ شعراے پر تنگ
 کس نہ گفتہ شعریم چوں سون درخ و دودی

و سے مراد محمد۔ شاکر سے مراد شکر رخ سے مراد درخ۔ سون دودی سے مراد سعدی میں نے اور اشعار چھڑ دیے۔ رینختہ تو درکنار فارسی میں بجز سعدی کسی

یہ بھی حریف منہ میں کاوش نہیں کی ہے۔ طویل غزل ہے۔

بہر کیف سازندے آئے اور گانا شروع ہوا اور بقول مرزا میکس چوں بسیار مخطوط منورند و خیالہا ہم متلفذ ساخت غنایت سرکلر والا قیمت آہنا شدہ
عشق آمد و خرقہ پوشین فرد خستہ

اکبر و عباس سلاطین مغویہ ایران میں تھے۔ میرزا نے شاہی سازندوں کو حلیہ شاهی دے کر حسام الدولہ پر گویا ہر کردیا کہ سب ہرچہ غنیمت ننگ من است
تقریب شاگردی تو ہو گئی مگر میرزا نے بادشاہ کی شاعری کے متعلق اچھا خیال نہ کیا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

شاہ عالم کی شاعری

آفتاب تخلص قرار دادہ اند چند بیت از سہ چہار غزل فرستادہ ہونہ۔ ارادہ سخن ہم مانی الغیر ایشان بعضے ازاں خیال
عمدہ اند۔ باکہ ہونہ بہ اصلاح حال فقراء خود گرفتاریم کجا دماغ و فراغ اصلاح کلام بادشاہ داریم اس سے مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ بادشاہ ٹوٹی پھوٹی شاعری
کہتے تھے۔ ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں۔ ناخود گویائی دہم دریں مہکام نذر بادشاہ کردہ ام گو یا بادشاہ کی فارسی شاعری میں سب کچھ میرزا میکس کا جلوہ ہے۔
نہتر عشق کے مطابق آفتاب تخلص آں بادشاہ سخن از تجویز میرزا است

الآباد میں میرزا دستہ بستے پہنچے گھبرا گئے۔ ان کے متعلقین لکھنؤ میں تھے۔ جب وہ گھبرا گئے تو بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوئے کہ یہ خط پیش کیا۔
عرض حال صفحہ ۵ مکرانہ جعفری۔ اس مجموعہ کا پہلا خط ہے۔

سابق دوسرے سال کہ بموجب حکم اقدس بہست آباد در آمد دئے معلیٰ حاضر بود دعائے و شنائے بندگان حضور می نمود چند سطروں کے بعد فاخر نیاز
ہیں حاضر است بغیر امید کہ میرزا غامد اس کے بعد چند مدحیہ اشعار لکھے ہیں

سلام نیازی کہ مقبول بادا
کہ تا عرض حال غریباں نماید
زمن جانب شاہ مرسل بادا
زباں درد و حادثات کشاید
بگو بد شہنشاہ جم جہا مارا
فراموش کردی میکس گذارا

چار پانچ اشعار اور ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار بادشاہ کی خدمت میں اس وقت پیش کیے گئے جب میرزا الدولہ احمد شاہ ابدالی تک بادشاہ کا پیغام
پہنچا کہ آباد واپس چلے آئے تھے۔ اور حسام الدین خاں کے اقتدار میں فلول پڑ رہا تھا۔ حسام الدین خاں وجیہ الدین خاں خاں کشمیری اور راجہ رام
نامہ سب مل کے میرزا الدولہ کے خلاف سازشیں کر رہے تھے۔

میرزا مناسقی خاں میرزا الدولہ۔ ان پر ایک طویل مقالہ استاذی پروفیسر حسن مسکری صاحب مدظلہ کا شائع ہو چکا ہے۔ یہاں میرزا
میکس نے جو میرزا الدولہ کے متعلق خط ۱۳ صفحہ ۱۱ بنام راعب میں تحریر کیا ہے پیش کر دیتا ہوں۔

میرزا الدولہ

"بہ سبب رسیدن میرزا الدولہ تغیر و تبدل کا دبا دیا ران دیدہ می خوانند کہ ازین شہر ہر زخم لبیکن مرضی بادشاہ را فان مہرباں در رفیق من نمی بیند"
مطلب یہ ہوا کہ میرزا الدولہ کے آنے سے کاروبار سلطنت بدل گیا۔ میرزا کے بعض دوست یہ چاہتے تھے کہ میرزا آباد سے کہیں اور چلے جائیں۔ مگر
خان مہربان اس میں بادشاہ کی مرضی نہیں پاتے تھے اس کے بعد تحریر کرتے ہیں۔

میرزا الدولہ از قیرہ طہارہ در حق مقرباں بخیاں باطل مشغول است۔ لہذا دل ازین محبت نا طامع طول است دسواں جریب یہ علی خاں طاحمرہ نمیت
علی خاں میرزا میکس کے بھانجے تھے جن کا یومیہ بعد درود آباد بادشاہ نے مقرر کر دیا تھا۔ سفارت کا کام انجام لے کے میرزا الدولہ جب آباد واپس آئے تو
حسام الدولہ کی سیاسی چالوں میں آگئے۔ مراجعت بادشاہ کے بعد آباد سے واپس عظیم آباد چلے آئے۔ اور حسام الدولہ کی وجہ سے دہلی نہ گئے۔ بہ خط ۱۱۸۴
کی یادگار ہے۔ اسی سال مرہٹوں کی مدد سے بادشاہ شاہجہاں آباد روانہ ہوا۔ کچھ نیک اس طرف فرخ آباد میں عماد الملک مذکور موجود تھا جس نے شاہ عالم کے باپ عالم گیر
ثانی کو دھوکے سے قتل کیا تھا۔ عماد الملک کو لشکر شاہ عالم لکھنؤ میں مرہٹے تھے خوف ہوا۔ اور وہ سید صاحب گاہا گاہا پنجاب گیا۔ وہاں سے سندھ و ادرج خاں
کھانا ہو گیا۔ شاہ عالم مع حسام الدولہ وجیہ الدین خاں راجہ رام نامہ اور میرزا نجف خاں داخل دہلی ہوا۔ میرزا میکس دہلی نہ گئے۔ اور لکھنؤ میں رک گئے۔ میرزا علی
خاں سید شاگرد میکس اس سفر میں بادشاہ کے ساتھ تھے۔ غالباً میرزا علی خاں سید سے میرزا کے تعلقات خوش گوار نہ رہے۔ جیسا کہ انیس الامہار کی

تحریر سے داغ ہوتا ہے۔

میرزا نے دوبارہ سفر بنارس کیا۔ پہلا سفر بعد دردد لکھنؤ وازشاہ جہاں آباد۔ اس دفعہ وہ شیخ محمد علی خاں سے ملنے کو بنارس گئے تھے۔ نشر عشق کی **سفر بنارس** عبارت ہے۔

”بعد چند سال برائے ملاقات شیخ محمد علی خاں بہ بنارس رفتہ دم در اوں سال مراجعت بہ لکھنؤ کرد“

میرزا قاضی لکھنؤ کے نام سے اپنے ایک شاگرد قاضی لطف علی خاں ناطق بنارسی کے نام خط ۱۵ صفحہ ۳۶ گھڑا جعفری میں تحریر کرتے ہیں۔
دیگر نیکو کہ سابق خود بدلت از راه کرم غلامی را طلبیدہ اند۔ یہ قاضی لطف علی کو لکھا ہے کہ میرا پیام نواب اکبر علی خاں تک پہنچا دو۔ اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۱۸۲ھ سے غایت ۱۱۸۴ھ تک نواب سید اکبر علی خاں بنارس میں موجود تھے۔

اکبر علی خاں کون تھے؟ یہ وہی اکبر علی خاں مجلی کے متعلق کنور پریم کتور بنیرہ راجہ گل کشور تروت سیفر نواب علی دردی **نواب سید اکبر علی خاں**
خاں مہابت خاں جنگ در شاہ جہاں آباد قانع عالم شاہی میں غلطی سے لکھا ہے۔ ”مکرم الدولہ علی اکبر خاں برادر **نواب میرزا اشرف علی خاں ناطق**“
تاج محل والدہ دلی عہد یعنی میرزا اکبر کے ماموں تھے۔ مجموعہ نغمہ میں ان کا پورا نام ”مکرم الدولہ سید اکبر علی خاں بہادر شہنشاہ جنگ“ لکھا ہے۔ یہی صاحب طبقات شعرائے ہند نے بھی لکھا ہے۔ دونوں تذکروں سے میرزا مجلی کی روایت مل جاتی ہے۔

یہ ناطق شہنشاہ عالم شاہی کی تشریحات میں تحریر کرتے ہیں کہ بہنایت نیک سیرت خوش مذاکر رنگیں طبع تھے۔ تمام عمر پیش و عشرت میں بسر کی علم کو سستی میں بھی دخل تھا۔ ان کی یادگار شعرائے ہند کا ایک تذکرہ تھا۔ اور ایک مثنوی نقل و دہی جن کا اب کہیں پتہ نہیں چلتا ہے۔ یہ میرزا جہاں آباد شاہ کے ماموں تھے۔ جس وقت کہ شیخ محمد علی خاں بنارسی اپنے شاگرد قاضی راجہ رام نرائن موزوں کے بلا سے پرلے ہیں۔

نواب سید اکبر علی خاں عظیم آبادی میں موجود تھے۔ شیخ محمد علی خاں دیوان شاہی میں بٹہ رہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ایک خط میں اکبر علی خاں کی سے نوشی کی شکایت بادشاہ کو لکھی بھی تھی۔

اسی زمانے میں یعنی ۱۱۸۴ھ میں جب راجہ شتاب رائے پرخسارانت کا مقدمہ کلکتہ میں چل رہا تھا معلوم ہوتا ہے کہ میرزا اشرف علی خاں ناطق بہن اکبر علی خاں کے پاس چلے گئے تھے۔ نواب اشرف علی خاں بنارسی میں موجودگی اس خط ۶ بنام قاضی لطف علی خاں ناطق سے ظاہر ہوتی ہے۔

میرزا ان کے بارے میں راقب کو تحریر کرتے ہیں ”یکے از سردار زادہ ہائے بنارس“ اور انہیں ”الاجبا“ کی **قاضی لطف علی خاں بنارسی** تحریر ہے ”قاضی لطف علی خاں ناطق در شہر بنارس کہ پایا بہ بیت۔ از سلاطین افغانی تا حال امت از اند“

در آباد بادراک محبت اکبر خاصیت ارشاد پناہی رسیدہ کلام خود را بہ اصلاح رسانیدند و دیوان قاضی محمد حسی نظری بعضی رسائل عرض و قافیہ بند کردند۔
میرزا لکھتے ہیں: ”چند کلمہ برائے نواب اکبر علی خاں بہادر قلمی است۔ فرستاد جواب مرسل شود“

اس خط میں غریب تمام امداد نظر پانے کی رسید ہے۔ **خط میکس بنام ناطق**
”ادلہ اشرف علی خاں فاد عمرہ برائے فقیرانہ محبت ہائے ذاتی فرستاد بودند از بنارس تا اینجا نتوانست رسانید غریب تمام اود حالہ نمود۔ میگوید کہ بہ سبب رطوبت ہوا در راہ بکشد“

یہاں اشرف علی سے مراد قضا ہیں۔ چونکہ ان کے مدد اکبر علی خاں سے تھے۔ ایک دوسرے اشرف علی خاں بھی ہیں جو پہلے میرزا کے شاگرد تھے۔ اور بعد کو منحرف ہو گئے۔ ان کی موجودگی بنارس میں ثابت نہیں ہوتی ہے۔

یہ تذکرۃ الشعراء کے مولف ہیں۔ جو ۱۱۸۷ھ میں تالیف ہوا۔ اس پر میرزا قاضی نے اصلاحیں دیں۔ مگر **میر علاء الدین اشرف علی خاں** مولف نے انہیں قبول نہ کیا۔ اور سودا کے آگے پیش کر دیا۔ اصلاحوں کی تردید میں سودا نے عبرت الناطق نام کا ایک رسالہ لکھا۔ اگر مذکورہ بالا خط سے مراد میر علاء الدین ہوتے تو میکس کسی نہ کسی دوسرے خط میں اس واقعے کا ذکر ضرور کرتے۔ مگر گھڑا جعفری اس واقعے کے ذکر سے خالی ہے۔

ایک خط میں لطف علی خاں بنارس کو لکھتے ہیں چنانچہ خود دیدہ اندک دھشت ان بہنارس سرابردہ و بالہ جاوید ایشیاں کجس قسمت در الہ آباد آئندہ
اپنے بنارس جلنے کے حالات سے راجب کو معفو ۱۳۳۲ میں یوں مطلع کرتے ہیں۔ خان صاحب پامہر دو فائے ناخبر۔ میں مسافر شکستہ خاطر کہ شقائق لقا
اجاب است بخیاں نامی کہ شاید فتنہ فتنہ دیدار ایشیاں حاصل نما بیدار بہر بے بال دیر کا رہ سپرے افستہ کرد۔ بہر فتنہ سبیلانہ ماسشہر بنارس رسیدہ
چندے کی خواست کہ بگوشتہ نشیندہ۔ اما پنجہ می بیند یاران الہ آباد دست بردارہ نیستند۔ ناچار بعد از شب بات غالب کہ مراجعت یہاں ملوث شود

مراجعت لکھنؤ میرزا ۱۸۳۱ھ یا ۱۸۵۵ھ میں شاہ عالم کے دہلی چلے جانے کے بعد پھر لکھنؤ واپس چلے آئے۔ اس وقت ان کا قیام دہلی نعت
میں ہوا۔ جہاں کو ایہ نہ دینے کے سبب ملک مالک سے محبت اور تکرار کی نوبت آئی۔ یہاں تک کہ ایک روز لکھنؤ سے بخیر چلے گئے۔
جس کا ذکر آئے آگیا اسی زمانے میں سودا اور مکین کا وہ محرکہ ہوا جس کو لفظی کے ساتھ صاحب آب حیات نے بیان کیا ہے۔ چونکہ یہ میرزا کے نجی خطوط
ہیں اس لیے ان کی صداقت میں کسی شک کا شک نہیں ہونا چاہیے۔

سودا و مکین یہ واقعہ ۱۸۸۹ھ کل ہے۔ اور آصف الدولہ کے عہد کا۔ ۱۸۸۸ھ میں آصف الدولہ سنداد دہہ پر بیٹھے امدان کے عہد میں وزیر
مختار الدولہ کی بن آئی۔ میرزا مکین نے جن جوہ خطوط میں سودا کا ذکر کیا ہے ان میں سادات علی خاں کا کہیں نام نہیں آیا ہے۔
اس جگہ کا فیصلہ بھی مختار الدولہ ہی نے کیا۔ اس لیے آب حیات کی روایت کی تصدیق ان خطوط سے نہیں ہوتی ہے۔ یہ کہنا سراسر غلط ہو گا کہ
سادات علی خاں نے اس محرکہ میں حصہ لیا کسی فریق کے حق میں فیصلہ دیا۔

میں ان تمام خطوط کو پیش کر دینا چاہتا ہوں جن میں سودا کا ذکر ہے۔ خدا کے فضل سے قیام قاضی لطف علی خاں ناقل متبانی میں تحریر کرتے ہیں
تدبیر ایام عجب نکر ہے مدہ سے شدہ۔ بھلا میں کہ کیے از ہندی گویاں کہ سودا نے عام خود را قیچ الفذرت در مراتب کام می دانند کہ مذکور سال
اکثر آمدہ اتہا ہزار گونہ رسوخ و خلوص می کہ دودہ خواست تغیر و تبدل کلام فارسی خودی نمود اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ سودا نے اپنے کلام فارسی پر
میرزا سے اصلاح چاہی۔

آخر کار پہلے رسیدہ کہ بیچ قسم در تابد دستی انتقال باقی دگناشت۔ قبول نہ کردم۔ ارادہ مجلس میناقت س یاران ظاہر کرد یہ لطافت حاصل گذر
انہم دگفتم۔ شمار کار خود شانی نہ دارید و مانند من کہ کوچہ بازار ہزار کس ہر طرف پیدای شود دست بمعاد کہ از خیال خود بظاہر نہ بود۔ یکا یک سیب تابیت
چنان شد کہ بقول دیوانہ سے شاگرد ہر عالم داستاد حزیتم۔ بھلا آید۔ حال نکار اول جنس گفتہ بود۔ استاد ہر عالم در شاگردہ خزیم میں معر علی ہر عالم
در شیخ خزیم علیہ الرحمۃ گفتہ۔ الفترہ باد محمد تہا ہل و تہا قل مخالفتی می کنند۔ چنانچہ بعد سے پیش نواب الدولہ بہ واسطہ عزیز سے استفادہ کر دیا آئندہ
دوسرے خط میں نواب معز اللہ خدیوہ بود جواب داد کہ یہ نام ثابت است کہ ظلمے بایچ اعدے سر دکاندار۔ ہر خوش باشان حکومت مد مشر واد نیست
بہ نسبت سے زخم و متب زدی گذشت۔ رسیدہ بعد ظلمے دے بجز گذشت اصل اس فقرہ کے دارد۔ فراغ دماغی خواہد۔ مشہور آفاق است۔ قال
حال خواہند شنیدہ مدہ معقولے ہا رسید۔ اما بقرا انتظام دین معنی حوازی کرد۔ با قول استاد بعل آورد دریں تالی کی بیتہ چند حسب حال تازہ بہ بہ
اگر دگی ہا ہر زبان قلم جاری شدہ ہا دیدہ دہاں ہر کلام کشیدہ

نہ نیاز خود فردشی دشمن ما منس بہرودی
ہا میں بے ایگی جوش غربداراں طع نامرد
مکانے چیدہ بہر گرم بازاری کہ از سودا
کند از لاف بے جا دست لاف تازہ ہر جا
لمتہ گوئی از گفتار صاحب مالکیاں گیرد
بہلئے گوہر معنی خامد گر چہ می دالم :-
نیکس آئندہ بازار کوراں از دل صافی
ہا بازار جہاں دارم عبت سودا نے بے سودی
خیال باطل از راقماشے کاش می بودی
نہ وارد گرچہ غیر از راہ محرومی دم دودی
بروے دست گیرد چند جسے دست فرسوی
کند از فریب تا کہ از قلب زہ اندودی
سخن کاش از زبان خامن گوش فرمودی
بروے تو کے در سچ صورت چشم لکھنودی

بہ سبب طحالت میں نے بعض اشخاص چھوڑ دیے ہیں۔ کیونکہ فارسی کا مذاق ہندوستان سے رخصت ہو گیا۔ سودا پر لکھنے والوں کے لیے یہ تحریریں کام آجائیں گی۔ کیونکہ گلزار جعفری کے مرتبہ دہ ہی نسخے اس وقت تک موجود ہیں۔ ایک نام کے پاس اور وہ سر امین لائبریری کلکتہ میں جو سر ہمدان سرکار مسلمان شیعہ تادم پٹنہ کانچ لکھے۔ یہ فارسی کا بچہ سودا کی شان میں ہے۔

میرزا آمانی آصف الدولہ ۲۴ ذیقعد ۱۲۹۸ جنوری ۱۸۸۱ء کو دہلی اودھ مقرر کیے گئے۔ تادم پٹنہ شیعہ ہے۔

گشت از پائے آصف الدولہ

۱۱۸۸ھ

لکھنؤ میں میرزا آباد سے ۱۱۸۵ھ میں واپس آچکے تھے۔ ان کے قدیم دوست دلی سام الدولہ کا ۲۹ ربیع الاول ۱۱۸۴ھ کو دہلی میں تختہ الٹ گیا تھا۔ وہ گرفتار کیے جا چکے تھے۔ اس عالم یاس میں میرزا کا تنہا سہارا برہان علی خاں رہیں فیض آبادی سے تھا۔ جنہوں نے لکھنؤ میں اقامت اختیار کرنی تھی یا جعفر خاں راعب سے جو بذریعہ ہڈی عظیم آباد سے برابر دہلی کے پاس لکھنؤ بھیجا کرتے تھے۔ جس کا ذکر گلزار جعفری میں میرزا کے خط میں موجود ہے۔

آصف الدولہ کا عہد رذیلوں کا عہد تھا۔ چنانچہ انشا اللہ خاں نے اسی عہد میں لکھنؤ چھوڑ دیا تھا۔ اور بدلی کھنڈ چلے گئے تھے۔ پھر کوہ سعادت علی خاں کے زمانے میں پھر لکھنؤ آئے۔ یہ عہد مختار الدولہ کی وزارت کا تھا۔ چنانچہ خود سودا کو بھی اس عہد میں کافی پریشانی حاصل ہوئی۔ میرزا ایک خط صفحہ ۱۸۵ بنام راعب تحریر کرتے ہیں۔

”لقد الحمد للہ شغفے معلوم را بہ سبب طعن و تشنیع کردن اہل ہوش زباں بہ اندر جملتہا کشیدہ دست حالاشنیدہ ام کہ اندر زکاہ محروم شدہ سرگشتہ و غیر اذیت کو در تلاش سعی و سفارش سرگراشت۔“

نگارے تند خور دام، متشر شکل و فلک شیوہ
بہر کس بد کند ویرانہ باشد مدے بہبودی
ایک جگہ راعب سے فرہنگ مانگی ہے۔ تاکہ سودا کے اعتراضوں کا جواب تحریر ہو صفحہ ۱۳۲ سودا کے بے قیمت حق ثنائے فروش و خرم گنارہ۔ چنانچہ عرض میں ایک دہ جاکوئی اصل فرہنگ نہ فرستادند کہ برائے یاد آوری ایساں سرمایہ نیز ہوشی مہال بود۔“

میرزا عمر بھر عوارض جسمانی میں گرفتار رہے۔ انہیں ثقل سماعت کی شکایت ہو گئی تھی۔ اور کسی عادت کے بتلنے پر
عوارض جسمانی
یہ دعا ہمیشہ پڑھا کرتے تھے۔ اللہم عافی فی بدائی اللہم عافی فی سمعی اللہم عافی فی بصری لا الہ الا انت حاجی احمد علی کو ایک خط صفحہ ۲۸ میں لکھتے ہیں۔

فقیرانہ و قلیک اجازت خواندن این از صاحب نفسی رحمتہ اللہ علیہ یا ختم گرامی گوش کہ در افتادنی بود ترقی نہ کرد
اسہال کی شکایت برابر ہی اود ایک دفعہ تپا محرقہ بھی آگئی تھی۔

آخر عمر میں عظیم آباد چلے آنا چاہتے تھے۔ کئی کئی خطوط اس معنوں کے راعب کے ہم کے ہیں۔ جن کو بہ سبب طحالت ترک کیا جاتا ہے۔
”نشر عشق میں تحریر ہے۔ بتاؤ بخبت و ہفتم شہر محرم الحرام ہند سنہ یک ہزار و ہفتم صد و ست و یک ہجری
سال رحلت جائے مدفن بہ مرض استرخاد فانیجہ میں جہاں گزراں مادر گفشت در باغ چینی لال ہمارہ زادہ دیانت کہ یہ متصل کہ جائے
نما کردہ اماں علی خاں مرحوم است مدفن گردید۔“

گویا میرزا کا انتقال مرض فانیجہ میں ۲۰ محرم الحرام ۱۲۲۱ ہجری میں ہوا۔ اس حساب سے انہوں نے ۸۳ سال کی عمر پائی۔ موہن لال
اقیس نے تادم پٹنہ رحلت کہا ہے۔ اے آہ مکین رفت اذی دار فنا

۱۲۲۱ھ

میرزا کے شاگرد و راجب سلسلہ الاحباب میں میرزا نے توفیل سے اپنے شاگردوں کا ذکر کیا ہے۔

بمجلس شوق ملاقات سن شنبہ خبر
بریں مجلس و یار و عزیز و جہاں پودر

۱ غرض کہ عمرہ شاہ اندازہ آباد
وجہ دولت دین خان دوستی آئیں
وجہ الدین خاں کشتی۔ یہی شخص مذکور

۲ شنبہ ذکر تو ازراہ رام نامہ اکثر
بود خدمت شاہنشاہ ہالیوں فر

قدم نگاہ شہر بھول کہ بادشاہ زمان
چراغ آں کہ مخاطب بہ میرزا امیر
واجہ رام نامہ دیوانہ ہوتا تھا شاہی۔ مہند امرا کو بھی میرزا کا خطاب دیا جاتا تھا۔

کچھ سن بودش در حق من اقرار

چشم معنی دزبالتش کام رہیں

یہاں علی خاں رہیں۔ ہر شہنشاہ کے لشکر میں شریک ہوتے۔ وہ ملک پرست بھی گئے تھے۔ جس کا ذکر میرزا کے ایک خط میں موجود ہے۔

چنانکہ نشر کہ مرغوب اد بود اکثر

یہ دیکھتے کہ بود سونے نغمہ راعب را

جفر خاں راعب۔ ان کا حال ابتدا میں تحریر ہو چکا۔ انہیں الاحباب میں ان کی چند غزلیں موجود ہیں جن میں کے دو تین اشعار میں نے نوٹ کر لیے ہیں۔

دگر فرقا نہ آید پیش من دیوانہ می خیزد
چہ شد بدلت چہ پیش آمد کہ دد از خانہ می خیزد

درد دیوانہ گم در محنت فرقا نہ می خیزد
بیاد آتیش و دے کثیم نالہ گری
اعتماد گلزار جعفری یہ ان کی ایک دہائی ہے

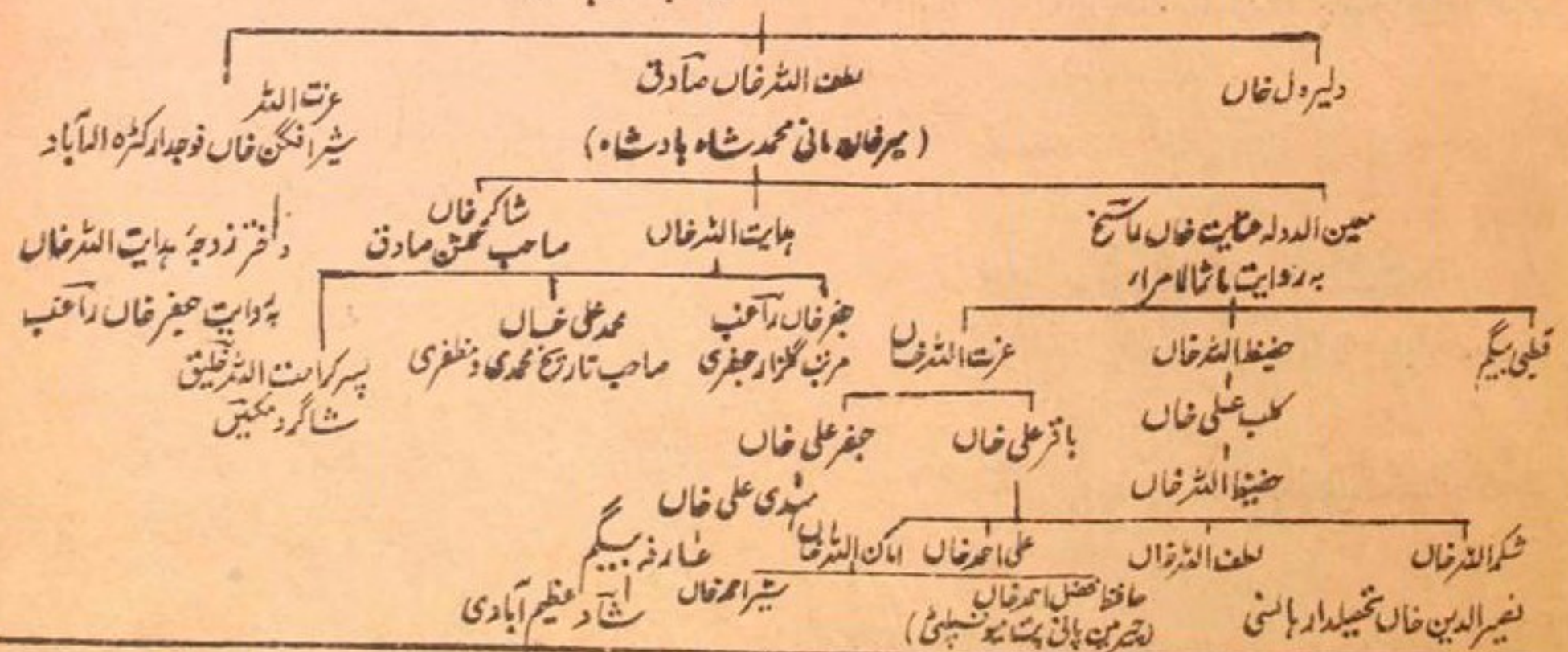
مدشکہ بدخواہ سرانجام گرفت
مدبرگ نو انگشتن ایام گرفت

اسی نسخہ کہ نگینی امتیام گرفت
بشگفت چوں راعب ایسا باغ مراد

گلزار جعفری کو دیکھنے سے پہلے یہ ہے کہ راعب نے اس نسخے کو اپنے چچا شاکر خاں کی تالیف ٹکٹو صادق کے تحت میں ترتیب دیا ہے۔ یہاں جعفر خاں راعب ادمان کے خاندان والوں کا سلسلہ نسب دے دینا بھی زیادہ مناسب ہو گا۔ کیونکہ اس خاندان کے زیادہ تر افراد میرزا مکیوں کے شاگرد تھے۔ اور ہندوستان میں بہت کم ایسے خاندان ہیں جنہوں نے اتنی تالیفیں اور تصنیفیں چھوڑی ہیں۔ یہ نسب نامہ میں نے آثار الامراء گلزار جعفری اور تذکرۃ الاسلاف کی مدد سے تیار کیا ہے۔ تذکرۃ الاسلاف تالیف ہے شاد عظیم آبادی کی۔ شاد کی ماں لطف اللہ خاں شاد کی اولاد میں ہیں۔

خواجہ عبد الرزاق خاں

(گزارہ توڑ فروغ دار گورکھ پور عہد شارجمہاں)



گلشن صادق کی تین چار جلدوں میں مرثیہ پہلی جلد خدا بخش خاں کی لائبریری ٹیپہ میں موجود ہے۔ دوسری اور تیسری جلدیں جو زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کا اس وقت تک پتہ نہیں چلا۔

۵ یہ پاک طبعی و پاکیزہ گوئی غیثت کہ بہت آل رسول وہ مذہب جعفر
بیر محمدی غیرت جن کا ذکر ادھر آیا۔ جب راجہ بیچارہ کا لڑکا مر گیا تو میرزا نے ان کے کہنے سے راجہ کو تفریق نہ لکھا۔
۶ یہ نطق ناطق بآواز خانہ ان بنی کہ بار لطف علی درود عالمش یاد در
لطف علی خاں بنارسی تافنی بنارسی۔

۷ یہ گفتگوئے خوش عاشقانہ ساکن کہ یاد شامل حالتی طہایت داد در
میرزا کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا نام شاہ عنایت ساکن تھا۔ اور یہ ایرانی نثر ادب کے بزرگ انیس الاحباب میں تحریر ہے۔ میرزا عنایت اللہ
ساکن گلزار جعفری میں ان کا نام ہے شاہ عنایت ساکن اور میرزا نے یوں مخاطب کیا ہے "شاہ صاحب دل آگاہ ہر باب الخ" "موسہ لال انیس کہتے ہیں
پیش از ہنگام احمد شاہ اجمالی وہ خط لکھو آمد۔ خود اور ملک ملازمت سرکار فیض آباد فواب دہلی مالک فواب شجاع الدولہ بہادر مرحوم ضلع گروہ پندہ
بعد چننے کے خاطر آزاد خاں آل را بر خود پسند پانڈا مان علاقہ مدد گاہ کشیدہ اور در سرکار بہادر بوسی سالک سالک بکت شاہ نذر علی علیہ الرحمۃ
بیت نمونہ یمن از ان در عظیم آباد رفتہ کلنے منتجب ساختہ در ان بستر سکونت خود را۔ انداخت "میرزا نے ان کو خط طہا عن کے ذریعے سے بھیجے ہیں۔
۸ یہ انس طبع انیس و کلام مانوسش کہ یاد روح انیسیت در سخن پافندہ
لالہ موسہ لال انیس مولف انیس الاحباب۔

۹ یہ ہوشندی دیوانہ در سخن سازی کہ حق بہیہ نگہ اندیش مذقنہ و شہر
سرب سنگ دیوانہ۔ ان کے نام کے دو خطوط گلزار جعفری میں ہیں۔ نثر حلق میں تحریر ہے۔ ان کے اہل بیت راجہ بہادر ان دیوان فواب وزیر الممالک
شجاع الدولہ بہادر قوم کھتری و مرد آزاد است و موطن بزرگان ایشاں پنجاب و مولدش داماد الخ لافنت شایرچاں آباد" ان شایرچاں آباد لکھنؤ آمدہ
اقامت گزیدہ

۱۰ یہ مشق شعر غلیظ و سخن سرالی اور کہی مذقنہ و سخن و ملت چوں خطا مضر
کلامت اللہ غلیظ راعب کے بھتیجے۔
گلزار جعفری میں دو خطوط بنام فواب محبت خاں میں۔ یہ فواب محبت خاں کو لکھے ۱۹ انیس الاحباب میں درج ہے۔
"اتخلص محبت غلظ الصدق فواب مستطاب ماقاد حمت خاں مظہر اند در ۱۱۱۱ھ بعد واقع شہادت والدہند گواہ خود بحسب انجور شہر لکھنؤ رسید
استقامت و زبید۔ در کلام ہندی مژدہ بامیر جعفر علی حسرت مخلص دارند۔ فارسی میں یہ میرزا میکس کے شاگرد تھے۔
ایک خاں میر خورشید علی خورشید بگرامی کے نام کا بھی ہے۔ نثر حلق میں ان کے متعلق تحریر ہے۔
آذ واسطہ داران میر عبد الجلیل مرحوم از مردم ساکن محلہ میدان پورہ است۔

"بنارسی رفتہ از محبت سراپا منفعت شیخ محمد علی خاں استغفار وہ برداشت و چندے بامیر نوراحسن خاں بگرامی کہ در اطراف عظیم آباد از طرف راجہ
شجاع الدولہ اقتدار و اختیار داشت گزارید ادل حال فصاحت مخلص کی کرد۔ چون نقدے کلام خود نزد میر غلام آزاد فرستاد میر میر در افکار سے ما
اسلام نمونہ پیش دے ارسال داشت و نوشت کہ مخلص خود را خود شہید قرار دہند۔"
ان اسماء کے علاوہ کاظم بیگ خاں مکن، میرزا علی قرین، میکین، خیراں، تیل، قابین، بلخ، عباس وغیرہ کے نام پائے جاتے ہیں جن کو بہ حسب
حوالت اور دست قلمش چھوڑ دیا جاتا ہے۔

شیخ بھی حرم کی ہے ساز و دیر کا بھی ہے
اب زمانہ سازی کا یاں دماغ بکس کو
دل کو بھلے جانی ہے ایک ایک اداس کی
اور کون جہانے کا تیری نرم کے آداب
بھرنی ہے جو مجھ سے آہ وہ نظر ستری
خلن آرزو کر کے جا رہے ہیں وہ سینگ
ہو سکا یہ میرا کاش آب کا ہو جائے
ماشتی کے فن میں یہ دیکھ کام میکش کے

تو صنم بھی ہے میرا تو مرا خدا بھی ہے
ورنہ پاک پیرا بن بارہا سیا بھی ہے
یاس اس محبت کی کوئی اتہا بھی ہے
ہم نے دل دیا بھی ہے بنے دل لیا بھی ہے
اس جہاں کو کیا کہیے جو تری وفا بھی ہے
ان اداس آنکھوں میں ایک التجا بھی ہے
دل کہ ہے مراد میں دوست آپ کا بھی ہے
بندہ تباں بھی ہے مرد با خدا بھی ہے

جاوید کمال رامپوری

نے آرزوئے وصل ہے نے انتظار ہے
تو پاس ہو نہ وہ تری یاد کیسا ہوتی
تلفیق منہ شوق بجا مشقتاں مگر
ہر برگ گل کہ باعث صدمہ و غم ہو
ہر نفسش خفا کہ منزل بدوش ہے
اے ہر دواں وہ گزیر ہوش و آگہی

شاید کہ آج دل ہی مرا سو گوار ہے
وہ یاد جس سے رشتہ غم استوار ہے
کیا کہیے کہ دامن دل تار تار ہے
سروک خار وہ قیام بہار ہے
ہر نقش یا چراغ سرور گزار ہے
چلیو سنبھل سنبھل کے کہ یہ کھئے یار ہے

سید حرمت الاکرام

کیا چیز ہے حیات کی اس طرف کی کا زہر
فریاد لے کے جائیں کہاں تیرے غم نصیب
اے نفرتی فضا و غضب اس طرح نہ ڈھاؤ
کس کے لہو سے شمع یہ غم نے جلائی ہے؟
ہوتی ہے کشتی روح فزا، آؤ ہم بتائیں
شکوہ نہیں یہ سادہ دلی کا ہے تحریر
تار و ایات مجھ سے گزاری نہ جائے گی
اک تیرا غم تمام نہ سکیں جسکی تلخیاں
تلخیاں حیات ہوا اور حبال گزار
کانٹوں کو عذر سا ہے کچھ اپنی سرشت پر
اے گردش حیات! نہ لے مجھ سے انتقام
حرمت فریب شوق کی نیرنگیوں کی خیر

کچھ مگر ہی کا زہر ہے کچھ کشتی کا زہر
دل کو ہلاک کر گیا دیدوری کا زہر
گھل جلتے روح میں نہ کہیں جاننی کا زہر
کیوں ہر نظر میں تیرا گیارہ دشتی کا زہر
وہ رات جس کے جام میں ہو جاننی کا زہر
ہو تار سے دھن سے سوا دوستی کا زہر
دل میں مرے اتار دوا اپنی منی کا زہر
تھا در نہ خوش گوار بہت زندگی کا زہر
جسکے سے کون گھول گیا آگہی کا زہر
کہتے ہیں یہ کہ ہم کو ملا ہے کلہی کا زہر
میرے لیے بہت ہے مری سادگی کا زہر
پتیا ہے کس خوشی سے زمانہ خوشی کا زہر

چھوکرہ

بہترین اور نفیس کوالٹی ہے
ہماری خصوصیات

کپڑا
سلکی پلین

جورجٹ

بجرگ

کریپ

سائن

ٹفٹ

بشٹ کلاٹھ

ٹشٹون ٹائلن

ٹنوں

ان کے علاوہ نفیس سوئی چھینٹ اور ادنی دھاگہ

تیار کردہ

دی امرلٹرین اینڈ سلک ملز پرائیویٹ لمیٹڈ۔ جی۔ بی۔ ٹی روڈ امرلٹر

تارکاپتہ :- "رین" (RAYON)

ٹیلی فون 2562

اسٹاکسٹ

ٹرافیکورین لمیٹڈ۔ برائے سلکی دھاگا اور مومی (سیلوفین) کاغذ